مقبوضہ سرزمین و آزادیٔ دین

محمد حسین مظفری

سرزمین عراق پر غاصبانہ تسلط اور اتحادی افواج کے فرائض کے بارے میں ماہرین قانون کے درمیان عالمی سطح پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری ہے۔ مقبوضہ سرزمین میں دین کی پیروی کی آزادی ایسا اہم موضوع ہے جس پر تمام عالمی معاہدوں اور کنونشنوں میں بھرپور تاکید کی گئی ہے لیکن گذشتہ چند برسوں کے دوران امریکی سیاسی ماہرین کے خیالوں اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے والی تہشیری یعنی عیسائی مبلغین کی جماعتوں کی منصوبہ بند سرگرمیوں کو دیکھنے کے بعد کسی مبالغہ و ہچکچاہٹ کے بغیر مکمل وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرزمین عراق و دیگر مقبوضہ علاقوں میں آزادی دین کے سلسلے میں کئے گئے عالمی معاہدوں کی پیروی کا اہتمام نہیں ہے۔ محترم مقالہ نگار نے عصری عالمی حقوق کی روشنی میں آزادیٔ دین کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اتحادی افواج کی ذمہ داری ہے کہ وہ عراقی عوام کو ان کے پسندیدہ دین کی آزادانہ پیروی کے لئے لازمی وسائل و امکانات فراہم کریں اور انسان دوستانہ امدادی سرگرمیوں پر بھرپور اور غیر جانبدارانہ نظارت کا فریضہ بھی انجام دیں۔ ادارہ

عراقی قبضہ سے کویت کی آزادی کے بہانے کی گئی فوجی سرگرمیوں کے دوران وہائٹ ہاؤس سے وابستہ عیسائی مبلغ فرینکالن گراہام نے انجیل کے ہزاروں عربی نسخے سعودی عرب میں واقع فوجی امریکی ٹھکانوں کو ارسال فرمائے تاکہ امریکی فوجیوں کے ذریعہ انہیں مقامی لوگوں کے درمیان تقسیم کیا جاسکے۔ عیسائی مبلغ کے اس اقدام سے نہ صرف عربستان کے قانون کی خلاف ورزی ہوئی بلکہ دونوں ملکوں کے درمیان ہونے والے معاہدہ کی روشنی میں بھی یہ بات ناجائز اور غیر قانونی تھی۔ جب نورمن شوارتسکوف نے اس موضوع کے بارے میں شکایت کی تو اس نے بتایا کہ وہ اعلیٰ افسروں سے لازمی احکام حاصل کرچکا ہے۔[1]

عراق میں عیسائی تبلیغی سرگرمیاں درحقیقت شمالی عراق میں ''آسمان امن'' کی ایجاد کے زمانے

1- Jane Lampman "A crusade after all? Plans of some Christians to envangelize as they offer aid pose dilemma for Iraqi reconstruction" the Christian Science Monitor April 17,2003

میں شروع ہوگئی تھیں کیونکہ آسمان امن کی ایجاد کے سایہ میں بہت سی عیسائی تبلیغی تنظیمیں انسان دوستانہ امداد کی فراہمی کے بہانہ شمالی عراق کی طرف روانہ ہوگئی تھیں۔ ان تنظیموں سے وابستہ ماہر سبلغین لوگوں کے درمیان کھانا اور دوا تقسیم کرتے وقت ایسی کتابیں بھی تقسیم کیا کرتے تھے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی اور ایسے موضوعات کی وضاحت ہوتی تھی جن کے ذریعہ قرآنی ارشادات کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان شکوک پیدا کئے جاسکیں۔[۱]

عراقی حالات سے وابستہ انسانی مسائل کا تذکرہ قرارداد ۶۸۸ میں موجود تھا۔ اس قرارداد کے ذریعہ عراق سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ عالمی امدادی تنظیموں کو جملہ لازمی وسائل و امکانات فراہم کردیئے جائیں تاکہ وہ اپنے مقصد کو پورا کرسکیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان تنظیموں سے وابستہ افراد کے خلاف طاقت کا استعمال ہرگز نہ کیا جائے۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے اس قرارداد کو اہم دستاویز قرار دیتے ہوئے عراقی کردوں اور شیعوں کو لازمی حفاظت فراہم کرنے کا بہانہ بناتے ہوئے آسمان امن (No fly zone) کی ایجاد کا کاروبار شروع کردیا اور تھوڑے دنوں کے بعد پرواز کے لئے ممنوع علاقے کی نشاندہی کردی گئی۔[۲] اسی طرح ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو رونما ہونے والے دردناک حوادث کے بعد امریکی صدر جمہوریہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کو صلیبی جنگ کا نام دے دیا۔ اگرچہ اس متنازعہ بیان پر ہونے والے داخلی اور بیرونی ردعمل اور احتجاجات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے اپنا یہ بیان فوراً واپس بھی لے لیا۔ پھر بھی دنیا کے اکثر لوگ اس متنازعہ بیان کے سلسلے میں متفکر ہیں کہ صدر جمہوریہ امریکہ نے اچانک ان کلمات کا استعمال نہیں کیا تھا۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں مقامی اور بیرونی مشیروں کے درمیان متضاد خیالات اور ٹکراؤ کے بارے میں مطالعہ کرنے والی جماعت کے سربراہ ڈاکٹر جان وایٹ اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عراق درحقیقت مغربی تبلیغی جماعتوں کی موجودہ پریشانی کا دوسرا منظر نامہ ہے۔ ان مبلغوں کو اپنے دینی عقائد کی تبلیغ کے لئے ایک نیا بازار حاصل ہوگیا ہے حالانکہ مقامی لوگ ان کی تبلیغ کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں اور عراقی سماج کے کسی طبقہ میں بھی ان کے تبلیغی مال کی کھپت اور مقبولیت بالکل نہیں ہے۔[۴]

دنیا کے اکثر ناظرین و ماہرین نے ''صلیبی جنگ'' نامی عبارت کو خفیہ مقاصد کی طرف ایک اشارہ

۱- شمالی عراق..... Tanseer htm

۲- بش ڈاکٹرین اور عراقی حملات کے قانونی پہلو'' از محمد حسین مظفری'' اطلاعات سیاسی و اقتصادی شمارہ ۱۱۰-۱۸۹، ص ۳۱

3- Johan Witt, Head of law and Religious Program. Atlanta Emory Univ.

4- Jane Lampman, op. cit

سے تعبیر کیا ہے۔ بُش نے دوسرے موقع پر اس تاریخی تعبیر میں اصلاح کی کوشش تو کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کے زیادہ تر سیاسی رہنما اس سلسلے میں مشابہ خیال کے حامل ہیں۔ افکار و عقائد کا تجزیہ کرنے والے ایک ادارہ کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ کے ۷۰ فیصد عیسائی رہنما اسلام کو درحقیقت ''دہشت گردی کا مذہب'' قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے ۸۱ فیصد لوگ مسلمانوں کو نصرانی بنانے کا خیال رکھتے ہیں اور یہ کام ان لوگوں نے Protestant عیسائیوں کی ایک بڑی تنظیم کے سپرد کر رکھا ہے۔[۱] مثال کے طور پر ایک کلیسا میں ایک بلند مرتبہ امریکی فوجی افسر کے بیان نے مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کر دیئے۔ بی بی سی نمائندہ واشنگٹن میں کہتا ہے کہ جنرل ویلیام بوئیکین، معاون وزیر دفاع (جمع آوری اطلاعات) نے اعلان کیا کہ اسلامی دہشت گرد امریکہ سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ امریکہ ایک عیسائی ملک ہے.....''۔ اس نے ایک دوسری نشست میں اپنے خدا کو اسلام کے خدا سے عظیم تر بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ''اسلام کا خدا بُت ہے'' اس کے علاوہ بوئیکین کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ یہ عوام کی اکثریت کی حمایت نہیں بلکہ خدا کی مرضی تھی کہ جارج بُش امریکہ کے صدر ہوگئے''۔[۲]

سیکولرازم: مخصوص صادراتی مال: برسوں سے مغربی ماہرین سیاست غیر معمولی حرص و طمع کے ساتھ لوگوں کو یہ مشورہ دیتے چلے آرہے ہیں کہ تم اپنے ملک میں مغربی ممالک کی پیروی میں سیکولر سیاسی و حکومتی نظام قائم کرلو کیونکہ مذہبی امور میں حکومت کی بیطرفی اور غیر جانبداری کے ذریعہ دیگر ادیان و مذاہب کی پیروی کرنے والوں کے حقوق اور ان کی مذہبی آزادی کی بہتر حفاظت کی جاسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض اسلامی ملکوں میں ایسے مفکرین و دانشوروں کی بڑی تعداد موجود ہے جو اپنے ملک میں سیکولر حکومت کی تشکیل کے خواہاں ہے جب کہ سمندر کے اس پار اس فکر و دانش کے مرکز میں ایک گروہ سے وابستہ لوگ فوجی ساز و سامان اور اسلحوں کے ذریعہ اپنے مخصوص اور پسندیدہ دین کی تبلیغ و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں اور دوسری طرف وہائٹ ہاؤس سے وابستہ مذہبی امور کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل [۳] کو عراق میں غیر حکومتی تنظیموں کا سرپرست مقرر کیا جاتا ہے۔ پس وہ ماہرین سیاست جو کل تک جو سیکولرازم یعنی حکومت کی مذہبی غیر جانبداری پر مبنی نظام کو انسانی سماج کا اہم کارنامہ بنا کر پیش

۱- ''مجموعہ انجلیکانیہ امریکیہ لتنصیر العراقیین'' جن کو روزنامہ الوطن قطر کے انٹرنیٹ سے درج ذیل پتہ پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ http:/www.alwatan.com/data/20030426/printit.asp?news=translate

۲- بی بی سی ۲۱ اکتوبر ۲۰۰۳ء

۳- Faith based initiatives. نامی مذکورہ رجسٹر میں مندرج، سماجی مسائل و مشکلات کے حل کے بارے میں کی جانے والی سرگرمیوں میں مذہبی تنظیموں کی شرکت کے بارے میں ۲۰۰۱ء میں پاس شدہ قانون کی بنیاد پر (Community Solutions Act 2001)

کیا کرتے تھے آج وہ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی سب سے زیادہ مسلح فوج کو عیسائی تبلیغاتی مشن کا تابع اور فرمانبردار بنادیں۔ کیا یہ ممکن و مناسب ہے کہ سیکولرازم کی حمایت و ترویج کی دعویداری و علمبرداری کرتے ہوئے کسی آزاد ملک کے خلاف فوجی طاقت کے استعمال یا اس ملک کی سرزمین پر فوجی قبضہ کے بعد رعب و دبدبہ و دہشت گردی کے سایہ میں کسی مخصوص مذہب کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا جائے اور ایک منظم منصوبہ بند پروگرام کے تحت تبلیغی مشن کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے؟ ایسے عالم میں جب کہ اسلامی ممالک میں دانشوروں کی ایک جماعت سیکولر نظام حکومت کی حمایت میں فلک شگاف نعرے بلند کررہی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغربی مفکرین اور مصلحین اپنے تمدن کے اس عظیم کارنامہ پر نظر ثانی میں لگے ہوئے ہیں یا نہایت خوش فہمی کے ساتھ اس کی نئی تفسیر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ۱۱ ستمبر کے دردناک حادثہ کے بعد امریکی صدر جمہوریہ کے ذریعہ ''دعا و عبادت کے قومی دن'' کا اعلان تھا۔[1] دوسری طرف گذشتہ دہائیوں کے دوران ''تحریک دہ فرمان'' نے یہ کوشش کی کہ دس فرمان کی تحریری کاپیاں چوراہوں، سرکاری عمارتوں اور درسگاہوں میں لگادی جائیں جب کہ امریکی عدالت عالیہ کے ۱۹۸۰ کے حکم کے مطابق ''دہ فرمان'' کو درسگاہوں میں لگانا اس ملک کے آئین کی اعلانیہ خلاف ورزی ہے۔ اس کے باوجود گذشتہ چند برسوں کے دوران اس تحریک نے قومی سطح پر غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔[2] شکاگو ٹریبیون (Chicago Tribune) کا بیان ہے کہ دہ فرمان فقط ایک مذہبی یا معنوی تحریک ہی نہیں بلکہ عیسائیت کو ملک کا سرکاری دین بنانے کی راہ میں اہم اقدام ہے۔ آج کل انجلی کلیسا کی پیروی کرنے والے اکثر سرکاری عہدیداروں کے پیغامات کی ترویج و اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ اس عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کا اہتمام ہے جو صرف Protestant فرقہ تک محدود ہے اور اس میں کیتھولک (Catholic) اور دیگر فرقوں کے عیسائی شامل نہیں ہیں۔[3] الاباما ایالت کے سپریم کورٹ کے قاضی روی مور نے دہ فرمان کے تحریری کتبہ کو عدالت گاہ کی ''مونت گومری'' نامی عمارت کے سامنے ۴ فٹ کی بلندی پر نصب کروایا ہے۔[4] اس سلسلے میں اس کا یہ قول ہے کہ یہ وہ قوم نہیں ہے جو بودائی یا ہندوئی اصول کی بنیاد پر وجود میں آئی ہو۔ اسلام بھی ہمارا دین نہیں ہے اور ہم قرآن کی پیروی نہیں کرتے ہیں بلکہ ہم لوگ انجیل کے پیرو ہیں اور یہ

1- "Some fear Bush's call to faith will blur church state lines". Bob-Kamper
2- Available at: http://www sulivan country.com/identitop fundies-declare. htm.
3- Lewis Loflim, op. cit 4- Ibid

قوم عیسائی قوم ہے''۔[1]

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہائٹ ہاؤس کو چاہیے کہ وہ صدر جمہوریہ امریکہ کے دوستوں کی ان سرگرمیوں کی باقاعدہ روک تھام کرے تاکہ لوگ یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو جائیں کہ امریکہ نے عراقی عوام کو عیسائی بنانے کے لئے اس ملک پر فوجی حملہ کیا ہے۔ ڈاکٹر وایٹ کا خیال ہے کہ یہ پابندیاں قانونی اصولوں کی حاصل ہیں۔ درحقیقت قانون اس قسم کے مفروضات کی اعلانیہ تردید کرتا ہے اور فوجی قوانین نے اس سلسلے میں بہت سی پابندیاں بھی لگائی ہیں۔[2] جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ڈاکٹر سید حسین نصر کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی حقوق کے عالمی منشور میں مذہبی حقوق و آزادی کو باقاعدہ جگہ دی گئی ہے لیکن مناسب تبلیغاتی وسائل اور طریقہ کار جیسے اہم مسائل کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔[3] مادود بری[4] ان اقدامات کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے عملی رنگ و روپ کے بارے میں کہتا ہے''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عیسائیوں کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ لوگوں کو اپنے دین کی طرف دعوت دینی چاہیے لیکن اس سلسلے میں وقت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس وقت عیسائیوں اور امریکیوں کے سلسلے میں بی اعتمادی کا بازار گرام ہے لہذا اس ضمن میں جو بھی قدم اٹھایا جائے اس کے لئے عراقی عیسائیوں او رعربستان میں موجود عیسائی تنظیموں کے درمیان بھرپور تعاون لازمی ہے۔[5]

اس تحقیقی مقالہ کی ابتدا میں انسانی حقوق کے عالمی قوانین کے سایہ میں آزادیٔ دین اور اس کے مسائل کے مختلف پہلوؤں کا بھرپور مطالعہ پیش کیا جائے گا تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ آیا ڈاکٹر وایٹ کا یہ خیال درست ہے کہ عیسائی تبلیغی جماعتوں کو اس سلسلے میں مطلق حق حاصل نہیں ہے یا ڈاکٹر نصر کا یہ خیال صداقت پر مبنی ہے کہ عیسائی تبلیغی جماعتیں مذہبی حقوق و آزادی کے سلسلے میں خلاف قانون سرگرمیوں میں لگی ہوئی ہیں اور آخر میں یہ دیکھنا بھی لازمی ہوگا کہ مختلف عالمی اسناد و مدارک اور اصول و قوانین کے سایہ میں ان سرگرمیوں کو کیسے جاری رکھا جاسکتا ہے؟ اس مقالہ کے آخر میں عراقی عوام کو ان کے مقبوضہ وطن میں فراہم مذہبی حقوق و آزادی کا مکمل تجزیہ پیش کیا جائے گا مقالہ

1- J. Dudley Woodberry. Prof. of Islam at fuller theological Seminary in Pasadena Calif.
2- Lewis Loflim, op. cit 3- Ibid
4- J. Dudley Woodberry. Professor of Islam at fuller theological Seminary in Pasadena Calif.
5- Lewis Loftin, op. cit

کے آخری حصے میں اس مسئلہ کی وضاحت کی جائے گی کہ عراقی عوام کو مذہبی اعمال انجام دینے اور انہیں مذہبی حقوق سے مالا مال رکھنے کے لئے حملہ آور اور قابض افواج کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور مقبوضہ سرزمین میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے کن اصول وقوانین کا سہارا لیا جاسکتا ہے۔

آزادیٔ دین اور عیسائی مذہبی تبلیغات: تاریخی اعتبار سے ان ادیان مذاہب کو قدرے حمایت و سرپرستی حاصل رہا کرتی تھی جو نظام حکومت کے لئے خطرہ نہیں پیدا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر قدیم روم میں حکومتی اصول وقوانین کی خلاف ورزی نہ کرنے والے مذہبی اعمال انجام دینے کی سہولت و آزادی حاصل تھی[1] قرون وسطی میں عیسائیت کو یوروپ پر حکومت کرنے والا مذہب تسلیم کیا جاتا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی میں تحریک اصلاح دین کا سلسلہ شروع ہوتے ہی ایک سرکاری دین کی حیثیت سے کیتھولک مذہب کے اقتدار میں زوال سا پیدا ہوگیا۔ جیسے جیسے کیتھولک کلیسا کی طاقت میں کمی واقع ہورہی تھی، ویسے ویسے دیگر تمام مذہبی جماعتوں اور فرقوں کے درمیان مذہبی عداوت اور اختلافات کو دور کرنے کا خیال شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ حکومتیں اپنے ہم جماعت لوگوں کی حفاظت و حمایت کے لئے پڑوسی ملکوں میں مداخلت بھی کرڈالتی تھیں۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ صلح و سلامتی کی حفاظت اور ضمانت درحقیقت ایک سیاسی ضرورت میں تبدیل ہوگئی۔[2]

موجودہ بین الاقوامی قوانین میں آزادی دین: تاریخی اعتبار سے مذہبی جماعتوں کی حمایت کا معاملہ اقلیتی جماعتوں کی حفاظت وحمایت سے وابستہ رہا ہے۔ اقلیتی جماعتوں کی حمایت وحفاظت کا پہلا دستورالعمل انیسویں صدی میں ''معاہدہ برلن ۱۸۷۸'' تشکیل ہوا۔ اس معاہدہ کے بموجب بالکن علاقہ کی حکومتوں پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ وہ اپنے عوام کی جان و مال اور عزت آبرو کا بھرپور احترام کریں۔ اس معاہدہ کے پچاس سال بعد پہلی عالمی جنگ اور یورپ کے سیاسی نقشہ کی دوبارہ تشکیل کے ساتھ ہی ساتھ دنیا کے اکثر لوگوں کو اپنے مذہبی تعلقات و رجحانات کی وجہ سے مجبوراً جدید بین الاقوامی سرحدوں کے درمیان ادھر ادھر ہونا پڑا۔[3] دوسری عالمی جنگ کے اختتام اور نازی

1- Jay A. Sigler "Minority Rights" A comparative Analysis, 1983, p 41. 2- ibid, p 56.

۳- بعنوان مثال معاہدہ ۳۰ جنوری ۱۹۲۳ء کی دفعہ ۱ میں لکھا ہوا ہے کہ آرتھوڈیکس عیسائیوں کو ترکی سے یونان منتقل ہوجانا چاہیے اور جو مسلمان یونان کی نئی سرحدوں کے درمیان سکونت پذیر ہیں وہ ترکی جاسکتے ہیں۔

حکومت کے ذریعہ یہودیوں کی بے مثال مذہبی تعقیب کو مستند حیثیت حاصل ہو چکی تھی اور نازی حکومت نے مذہبی تعلقات کو ایک اہم سیاسی مقصد میں تبدیل کر دیا تھا۔ بین الاقوامی برادری کا ردعمل جنگ کے دو ہولناک مظالم اور دو مختلف سمتوں میں جلوہ نما ہوا۔

عالمی انسانی حقوق کا اعلان: اقوام متحدہ میں شعبہ اقلیت کے سربراہ نے انسانی حقوق کے منشور کے اجراء کو اقلیتوں کے مسائل کے حل کے لئے ایک ممکن تجویز قرار دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مذہبی اقلیتوں کے حالات کے بارے میں کہا کہ ان لوگوں کے حالات کا صحیح اندازہ اسی وقت ممکن ہوگا جب عالمی برادری کی ضمانت و حمایت کے ساتھ انسانی حقوق کے ایک منشور کو سبھی لوگوں کی حمایت و منظوری حاصل ہو جائے۔[1] دوسری عالمی جنگ کے دوران رونما ہونے والے انسان سوزی اور بے رحمانہ قتل عام کے جو حوادث رونما ہوئے تھے ان کی روشنی میں انسانی حقوق کے عالمی معیاروں کی غیر معمولی ضرورت کو پوری طرح واضح کر دیا تھا چنانچہ اقوام عالم کے درمیان مشترکہ معیاروں پر مشتمل انسانی حقوق کے عالمی منشور کو ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کے عام اجلاس میں پیش کیا گیا اور اس عالمی ادارہ نے اس منشور کو مکمل اکثریت کے ساتھ پاس کر دیا اور کسی ممبر ملک کی جانب سے اس کی مخالفت نہیں ہوئی۔[2]

واضح رہے کہ انسانی حقوق کے اس عالمی منشور کو اقوام متحدہ کی قرارداد کی حیثیت سے مکمل منظوری حاصل ہو چکی ہے کیونکہ اس معاہدے میں جن باتوں پر ہم لوگوں کا اتفاق ہے وہ اخلاقی ارزش و اقدار کی حامل نہیں قانونی اعتبار سے ان باتوں کو لازمی قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ دوسری عبارت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو حضرات صف میں کھڑے ہوئے ہیں انشاء اللہ فرصت ملتے ہی ان کے مسائل کی طرف توجہ دی جائے گی۔

اس قرارداد کو قانونی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ اس کے باوجود اس کو ایک مستحکم اخلاقی معاہدہ شمار کیا جاتا ہے اور عالمی برادری سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس معاہدہ کی مکمل پیروی کرے گی۔ درحقیقت وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ آج ان معاہدوں کو مکمل قانونی آثار و دستاویز کی حیثیت

1- League of Nations and National Minorities R.D. Azacarate an experiment-1945, p. 6
2- Proclamation preceeding the text of the Declaration. G.A. rexuturs No. 217-A

حاصل ہو چکی ہے اور ان معاہدوں سے وابستہ بعض قواعد کو عالمی حقوق کے خصوصی قواعد میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔[1] بعض ماہرین قانون کی نظر میں، اس اعلانیہ میں مذکورہ و مندرج اکثر حقوق اور آزادیوں کو اب قانون کے اصول کلی کا درجہ حاصل ہے اور ان میں سے بعض کو بین الاقوامی قوانین کے عرفی قواعد کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔[2]

عالمی انسانی حقوق قرارداد کی ۱۸ویں دفعہ کے پہلے بند میں اس موضوع کی مکمل وضاحت موجود ہے کہ مذہبی آزادی کے ساتھ مذہب کی تبدیلی کا حق بھی لازمی ہے۔ ہر فرد کو فکر و وجدان و دین کی آزادی کا حق حاصل ہے جس میں دین وعقیدہ کے انتخاب کے ساتھ اس میں تبدیلی کا حق بھی حاصل ہوتا ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ دین کی تبدیلی کی آزادی کی تجویز لبنان کے ایک عیسائی نمائندہ کے اصرار کی وجہ سے معاہدہ میں درج کی گئی اسلامی ممالک کے نمائندوں نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی۔ عربستان کے نمائندہ کے اصرار کی وجہ سے معاہدہ میں درج کی گئی اسلامی ممالک کے نمائندوں نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی۔ عربستان کے نمائندہ نے اپنی مخالفت کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ کوئی مسلمان اپنا مذہب تبدیل کرے لیکن پاکستان کے نمائندہ نے، جو قادیانی مذہب کا پیرو تھا، لبنانی نمائندہ کی تجویز کی حمایت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ تجویز شدہ عبارت اسلام کی روح سے مطابقت رکھتی ہے۔ چنانچہ ووٹنگ کے وقت عربستان کے علاوہ اجلاس میں موجودہ کسی دوسرے اسلامی ممالک نے اس تجویز کی مخالفت نہ کی لہذا اس بات کی نفی و تردید ناممکن ہے کہ عالمی انسانی حقوق معاہدہ کے منشور میں تبدیلی دین کی آزادی کا حق درج ہے اور آزادیٔ دین کے حق کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ تبدیلیٔ دین کی آزادی کا حق بھی تصویب شدہ ہے۔

منشور میں اس عبارت کے اندراج کی مخالفت کرنے والے اسلامی ملکوں کا اس سلسلے میں یہ استدلال تھا کہ منشور میں اس دفعہ کو محض عیسائی تبلیغی جماعت کے مفاد کو نگاہ میں رکھتے ہوئے شامل کیا

1- Proclamation preceeding the text of the Declaration. G.A. Res. 217 A (III) U.N. Doc. A/810 at 71, 1948

2- Reservation to the Convention on the Prevention and Punishment of the Crime of Genocide, Advisory Opinion, 28 May 1951. International Court of Justice. عالمی عدالتی ادارہ کے قاضی نے حکومتوں کو ان معاہدوں کا پابند قرار دیا ہے۔ بین الاقوامی عدالت گاہ کے قاضی نے قتل عام کنونشن پر اعلامیہ حق شرط کے بارے میں اپنے مشاورانہ و مخالف و ذاتی نظریہ کو بیان کرتے ہوئے یہ دعوی کیا ہے کہ مندرجہ اصول کنونشن میں پاس ہو چکا ہے اور متمدن اقوام کے ساتھ کسی معاہدہ و قرارداد کے بغیر بھی حکومتوں کے ذریعہ اس کی پیروی کو لازمی قرار دیا جا سکتا ہے۔

گیا ہے تا کہ لوگوں کی احتیاج اور پریشانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں تبدیلی دین و مذہب کی طرف راغب کرسکیں۔[۱] اس منشور کی تدوین و تالیف میں سرگرم لوگوں نے یہ امید لگا رکھی تھی کہ ان حقوق اور آزادیوں کو آئندہ ہونے والی کسی مفصل قرارداد میں شامل کرتے ہوئے اس پرعمل کو لازمی قرار دے دیں گے چنانچہ ۱۶ دسمبر ۱۹۶۶ء کو دو مختلف معاہدوں میں اس اصول کو شامل کرتے ہوئے اس پرعمل کو لازمی قرار دے دیا گیا۔

عالمی سیاسی اور تہذیبی حقوق کا معاہدہ

اس معاہدہ کے مقدمہ میں اقوام متحدہ کے مذکورہ بالا منشور کے بنیادی اصول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بنیادی انسانی حقوق اور آزادیوں کی تائید وحمایت کی گئی ہے اور اس معاہدہ میں زیادہ تر انہیں حقوق و آزادیوں کا ذکر ہے جن پر عالمی انسانی حقوق کی پیروی کی تائید کی گئی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عالمی انسانی حقوق منشور کی دفعہ ۱۸ کی عبارت کو اس معاہدہ میں نقل کردیا گیا ہے۔

۱- ہر فرد کو فکر و وجدان اور دین و مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہوگا۔ اس حق کے ذیل میں اس شخص کو اپنے پسندیدہ مذہب کے اختیار و پیروی کی آزادی بھی حاصل رہے گی۔

۲- کسی شخص کو کسی مذہب کے قبول کرنے یا کسی مذہب کی پیروی کرنے کے لئے مجبور نہ کیا جائے گا اور نہ ہی اس کے مذہبی عقیدہ پر کسی کو حملہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ مذہب کی پیروی میں زور زبردستی یا کسی دباؤ کی ممنوعیت کو درحقیقت دین وعقیدہ کی مکمل آزادی شمار کیا جاتا ہے۔ پس دین میں جبر کی ممنوعیت کا مطلب ہے کہ کسی شخص کو اس بات کے لئے مجبور نہ کیا جائے کہ وہ اپنے باطنی اور پسندیدہ مذہبی عقائد سے روگردانی کرتے ہوئے کسی دوسرے مذہب سے اپنی پسندیدگی اور لگاؤ کا اظہار کرے۔ درحقیقت انسانی حقوق کے بارے میں اسلامی ممالک کی بدگمانی کے نتیجے میں اس معاہدہ کی تدوین میں لفظ ''تبدیلیٔ دین'' کی اصلاح ہوجائے۔ چونکہ اس معاہدہ کو بین الاقوامی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا تھا لہذا اس کی عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لئے تمام حکومتوں کی جانب سے اس کی حمایت بھی لازمی تھی اسی وجہ سے اسلامی ممالک کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے عالمی انسانی حقوق معاہدہ کی قرارداد کی دفعہ ۱۸ میں دوسرے بند کو شامل کردیا گیا۔

۳- **مذہبی عدم تحمل کا اعلانیہ:** مذہبی عدم تحمل و عدم مساوات کے اعلانیہ کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ

۱- محمد حسین مظفری، نا بردباری مذہبی، تہران ۱۹۹۷، ص ۷۴، ۷۵

اس میں کوئی شک نہیں کہ دین و مذہب پر عقیدہ و ایمان رکھنے والے شخص کے لئے مذہب زندگی کے حقیقی معنی و مفہوم کی شناخت کا بنیادی سبب ہوتا ہے لہذا مذہب وعقیدہ کی آزادی کی مکمل ضمانت ہونی چاہیے۔حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مذہبی عدم تحمل کے منشور کو غیر معمولی توجہ کے ساتھ آمادہ کرتے ہوئے یہ کوشش کی گئی ہے کہ عالمی انسانی حقوق کے منشور میں حق تبدیلی مذہب کو فراموشی کے سپرد کردیا جائے۔ہوناتو یہ چاہیے تھا کہ مذہبی حقوق و آزادیوں سے متعلق تمام باتوں کی مکمل وضاحت کردی جاتی۔ بہرحال موجودہ معاہدہ کے متن میں قدرے تخفیف کے ساتھ یہ کہا گیا کہ ہر شخص فکر و وجدان اور دین و مذہب کی آزادی کا حامل ہے اور اس حق کے ذیل میں انسان اپنے پسندیدہ دین و عقیدہ کی پیروی کے لئے آزاد ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان عالمی اسناد و مدارک میں مندرج مفاہیم کے درمیان ہم آہنگی کیسے قائم کی جائے؟ انسانی حقوق کمیشن سے وابستہ تحقیقی امور کی صدر ایلیزابتھ اوڈیو بینیٹو نے اس سوال کے جواب میں یہ کہا کہ منشور کے بغور مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان دستاویزوں کی عبارتوں کے درمیان اختلاف تو پایا جاتا ہے لیکن ان کا مفہوم ایک ہے کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دین و مذہب وعقیدہ کو ترک کرکے دوسرے دین وعقیدہ کا انتخاب کرلے یا لامذہب اور بے عقیدہ رہتے ہوئے زندگی بسر کرے۔منشور کے اعتبار سے ضمنی طور پر یہ مفہوم آزادی فکر و وجدان اور دین و مذہب کے مفہوم سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے بشرطیکہ عبارت کے اندازِ بیان کی طرف زیادہ توجہ نہ دی جائے۔[1] اگرچہ اعلان یہ کیا گیا ہے کہ مختلف دستاویزات کی عبارتوں میں موجود اختلافات کی وجہ سے انسانی حقوق کی ماہیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اسناد کے تطبیقی مطالعے کی روشنی میں مفہوم کے درمیان موجود تردید و اختلاف کی نشاندہی ہوجاتی ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ عبارتیں مختلف مفاہیم کی حامل ہیں اور عبارتوں کے درمیان موجود اختلاف کی وجہ سے مختلف قسم کی تفسیروں کے بیان کی راہ ہموار ہوجاتی ہے۔[2]

بہرحال عیسائی تبلیغی جماعتوں کے ذریعہ اس قانون کے ممکنہ ناجائز استعمال کو روکنے کی غرض سے ''دینی عدم تحمل'' کی ایسی اصلاح کردی گئی کہ لوگوں کی احتیاج اور پریشانی کو ان کے دین کی تبدیلی کا

1- Elizabeth Odio Benito, "Study on the Current Dimension of the Problems of Intolerance and Discrimination on grounds of Religion of Belief". UN Poc. E/CN.4 su6/2/1987/26/31 Aug. 1986, p. 50.

۲- محمد حسین مظفری، ایضاً

ذریعہ نہ بنایا جاسکے اور لوگ اپنی مجبوری و مفلوک الحالی کے دباؤ میں اپنا دین تبدیل کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ اصلاح شدہ عبارت سے مذہب وعقیدہ کی آزادی کا مفہوم بالکل واضح ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تبدیلی مذہب کے لئے لوگوں پر دباؤ ڈالنے یا ان کی پریشانیوں کے ناجائز استعمال کا امکان بھی نہیں رہ جاتا۔[1]

کرشنا سوامی نے اپنی تحقیق میں شدت پسند افراد و جماعتوں کے خلاف قانونی اقدام کی تجویز پیش کی ہے انہوں نے اپنے مجوزہ قاعدہ شمارہ ا میں تبدیلی مذہب کے لئے ''اجبار''، ''نامناسب ترغیب'' اور ''بے جا دباؤ'' کو پوری طرح ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی طرح قاعدہ شمارہ ۳ میں جس میں عدم مساوات کی روک تھام اور اقلیتی جماعت کے لوگوں کی حمایت کی بات کہی گئی ہے، مادی اور نفسیاتی دباؤ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔[2] دوسرے لفظوں میں اس ممنوعیت کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب لوگوں کو مال و متاع اور مادی فائدہ دے کر یا دینے کا وعدہ کرتے ہوئے انہیں اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب کو قبول کرنے کے لئے راغب کیا جائے۔[3] بہرحال یہ بات تسلیم کرلینی چاہیے کہ تبلیغ دین کے جائز اور ناجائز طریقوں کے درمیان کوئی نمایاں سرحد قائم کرنا بہت دشوار ہے لہذا دنیا کے مختلف ممالک اپنے سماجی اور ثقافتی حالات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مناسب اقدام کرتے ہیں

۴- **انسانی حقوق کا اسلامی منشور:** بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی انسانی حقوق منشور کی دفعہ ۱۰ میں عالمی انسانی حقوق اسناد میں مندرج معیاروں کی خلاف ورزی کی گئی ہے[4] لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان اسناد کے ابتدائی امور کے مطالعے سے ہی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مذکورہ عبارت ان اسناد کی حقیقی روح اور ان کے مولفین کے مقصد و ارادہ سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔ درحقیقت اسلام دین فطرت ہے اور یہ انسان کے خلاف جبر و اکراہ اور دباؤ و زبردستی کے استعمال اور انسان کی مفلسی و جہالت کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اسے تبدیلی دین کے لئے یا ملحد بنانے کے لئے کی جانے والی ہر حرکت کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ سردست حق آزادی دین کے ذیل میں ایسی باتوں کو شامل

۱- محمد حسین مظفری: ایضاً

2- Arcot Krishnaswamy, Study of Discrimination on the Matter of Religious Rights and Practices, 1960, pp.40-41

3- See Generally, Religious Human Rights in Global Perspective: Legal Perspectives 349 and 360 (Johan D van dar vyer Johan witt, Jrs eds) 1996

4- See J. Schwartlander H. Beilfaldt. "Christians and Muslims Facing the Challenges of Human Right" German Bishop Conference, Jan. 1994 i pp. 23-24

کرلیا گیا ہے جس کے ذریعہ بعض افراد و جماعتیں لوگوں کو مالی، معالجاتی، تربیتی اور تعلیمی سہولتیں فراہم کرکے ان کے دین و مذہب کی تبدیلی میں ہمہ تن سرگرم نظر آتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے منصوبہ بند ہمدردانہ ہتھکنڈوں کے ذریعہ انہیں اپنا مذہب بدلنے پر آمادہ کرلیتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کی تدوین و پیروی کی اصول وقوانین پر مشتمل جو سند تیار کی جاتی ہے اس میں ادیان و مذاہب کے ان ٹھوس وعدوں کو مناسب انداز کے ساتھ پسندیدہ مقام پر پیش نہیں کیا گیا ہے جن میں انسانوں کی اخروی نجات کی ضمانت فراہم کی گئی ہے بلکہ اسلامی انسانی حقوق کی دفعہ ۱۰ میں ان امور کا ترک کچھ اس طرح کیا گیا ہے جس سے دوسرے لوگوں کو غلط فہمی اور توہم کے علاوہ کچھ نہیں حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی انسانی حقوق کی عبارت کلیسائی بیانات سے بہت نزدیک معلوم ہوتی ہے۔ اس عبارت سے مخاطب یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ مادی اور نفسیاتی اکراہ اور دباؤ ایسی صورت میں مجاز نہیں ہے کہ اس کا استعمال مسلمانوں کے خلاف کیا جائے"[۱] لیکن دوسری طرف اسلام کی تبلیغ وترویج کے لئے اگر طاقت اور جبر کا استعمال کیا جائے تو جائز ہے۔ جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اسلام نے نہایت واضح لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ مذہبی جبر واکراہ و دباؤ کی ہر شکل کو مذموم قرار دیتا ہے اور زور و زبردستی کو اپنی تبلیغی سیاست میں نہ صرف کوئی جگہ فراہم کرتا ہے بلکہ اس کی بھرپور مذمت بھی کرتا ہے۔ بہتر تو یہی تھا کہ جبر واکراہ کی ممنوعیت والی آیۂ کریمہ سے استناد کرتے ہوئے یہ اعلان کردیا جاتا کہ اسلام دین و مذہب کی تبلیغ و ترویج کے لئے زور و زبردستی کے استعمال کو ممنوع قرار دیتا ہے چاہے دین حق کی اشاعت کے لئے ہی اس ظالمانہ روش کا استعمال کیوں نہ کیا گیا ہو۔

آزادی تبلیغ دین اور عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیاں: مجموعی اعتبار سے مذہبی تبلیغ کے مسائل ایک طرف آزادی بیان اور دین کے اظہار میں انسان کے انفرادی حق سے اور دوسری طرف انسان کے دین یا اس کے عقیدہ کی حفاظت کے لئے اس کے انفرادی حق سے مربوط ومبسوط ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر شخص اپنے پسندیدہ دین وعقیدہ کی حفاظت دوسروں کے اثر ورسوخ اور مداخلت کے بغیر انجام دے سکتا ہے چاہے یہ مداخلت حکومت کی طرف سے ہو یا افراد و جماعتوں سے جڑے ہوئے لوگوں کے ذریعہ کی جارہی ہو۔ اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ ہر شخص

۱۔ محمد علی تسخیری، حقوق الانسان بین الاعلان الاسلامی والعالمی، طہران ۱۹۹۷، ص ۸۰

کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی نجات کی نوعیت کے بارے میں خود فیصلہ کرے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس اہم کام کے لئے سماجی اثرات سے الگ تھلگ رہتے ہوئے تنہائی کے عالم میں اس کام کو انجام دے۔ جیسا کہ دین وعقیدہ کے اظہار کی آزادی کے لئے یہ لازمی ہے کہ ہر شخص اپنی دینی تعلیمات اور مذہبی اغراض و مقاصد کی ترویج و تبلیغ کے لئے پوری طرح آزاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادیان و مذاہب اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس طرح کی تبلیغی ذمہ داری انجام دیں۔ اگرچہ دین کی تبدیلی کے حق کو انسانی حقوق کے یوروپی کنونشن کے دوران کسی اختلاف و مخالفت کے بغیر پاس کیا جاچکا ہے پھر بھی انسانی حقوق سے وابستہ یوروپی عدالت اور کنونشن نے اس حق کو نہایت مضیق مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس کے باوجود بعض ادیان و مذاہب نئے پیروی کرنے والوں کی جستجو نہیں کرتے ہیں لیکن اکثر مذاہب اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ لازمی طور پر اپنے دین کے پیغام کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں چنانچہ وہ لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اپنے دین میں شامل کرلیں اور ان کے ہم مسلک لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے پس تبلیغ دین کے مسئلہ کا دو پہلوؤں سے مطالعہ کرنا لازمی ہے۔ پہلے مرحلہ میں ادیان و مذاہب کے اعتبار سے دینی تبلیغ، دین وعقیدہ کے اظہار کی آزادی کے اہم پہلوؤں میں سے ایک ہے اور ساتھ ہی اطلاعات کی آزادی کی مصداق بھی ہے۔ اسی وجہ سے انسانی حقوق کے منشور اور مذہبی عدم تحمل نامی قرارداد میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ دوسری طرف آزادی بیان اور اطلاعات کی آزادی سے وابستہ اصول و قوانین پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ لوگوں کی ایک مذہب سے علحدگی اور دوسرے مذہب کی طرف ترغیب میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ ایسے لوگوں کی راہ میں رکاوٹ بن جائے جو اپنے پسندیدہ دین کی پیروی اور حفاظت کے خواہاں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ دیگر ادیان و مذاہب کی پیروی کرنے والے مذہبی افراد یا جماعتوں کی طرف سے مخالفانہ کارروائی کا سلسلہ شروع ہوجائے اور مذہبی تبلیغات مختلف مذہبی جماعتوں کی پرامن وصلح آمیز باہمی زندگی پر بھی اثرانداز ہوجائیں اور تبلیغی پیغامات کی نوعیت اور تبلیغی راہ و روش کی ناپسندیدگی کی وجہ سے مختلف مذہبی جماعتوں کے درمیان جھگڑے اور ٹکراؤ کا ماحول پیدا ہوجائے۔[1]

1- See Natan Lerner, "Proselytism, Change of Religion and International Human Rights, Emory International Review, No. 12, 1998. p. 477, Martin shupack

۱- **عدالتی قوانین و روش میں دینی تبلیغ:** انسانی حقوق کمیشن کے خصوصی افسران کی رپورٹ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض ممالک نے عیسائی تبلیغی سرگرمیوں کے لئے اقدامات کی تجویز پیش کی ہے جب کہ بعض دوسرے ملکوں نے سزا کی بات فقط ان امور میں کہی ہے جن میں عیسائی تبلیغی جماعت سے وابستہ افراد لوگوں کے سامنے مادی مفاد کی تجویز پیش کریں۔ کچھ ممالک کے داخلی قوانین میں بیرونی ممالک کی ایسی تبلیغی سرگرمیوں کی ممنوعیت کا ذکر بھی موجود ہے جو لالچ اور مادی وسائل و امکانات کی فراہمی کے ذریعہ مقامی لوگوں کو مذہب کی تبدیلی کے لئے آمادہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ بعنوان مثال ۱۹۴۴ء میں ہایلہ ثلاثی نے ایک فرمان جاری کرتے ہوئے عیسائی تبلیغی جماعت کی ان سرگرمیوں کو غیر قانونی اومنوع قرار دے دیا جس کے ذریعہ وہ آرتھوڈیکس عیسائیوں کے مذہب کی تبدیلی کے خواہاں تھے جب کہ ان جماعتوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے ذریعہ تمام لوگوں کو متاثر کریں۔[1] اسی طرح یونان کے داخلی قانون میں بھی عیسائی تبلیغی جماعت کے بارے میں خصوصی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ''مختلف مذہبی عقائد میں دخالت کے لئے اٹھایا گیا براہ راست یا بالواسطہ اقدام یامادی و اقتصادی امداد کے ذریعہ یا مکر وفریب سے کام لیتے ہوئے کسی شخص کے کم اعتماد و تجربہ اور محدود عقل و دانش اور سادگی کا نا مناسب استعمال عیسائی تبلیغی سرگرمیوں کا اٹوٹ حصہ ہیں''۔[2]

عدالتی روش میں بھی اس قسم کی مثالیں موجود ہیں مثلاً یوروپی انسانی حقوق عدالت نے کوکیناکیس بنام یونان نامی مقدمہ میں اس بات کی تائید کی ہے کہ مذکورہ شخص نے اپنی سرگرمیوں میں ایسا طریقۂ کار اختیار کیا ہے جس سے مرد مخاطب کے ذاتی مذہب وعقیدہ اور آزادیٔ دین کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔[3] اس سے قبل کوکیناکیس یونان کی داخلی عدالت گاہوں میں اس بات کا مجرم قرار پاچکا تھا کہ اس نے متعلقہ قوانین کی طرف سے لاپرواہی اور بے توجہی سے کام لیا ہے۔ عدالت کی نظر میں اس کا جرم یہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ خانم کاریاکی کے گھر گیا اور یہ بہانہ بناتے ہوئے کہ اس کے لئے خوش خبری لایا ہے، اس کے سامنے اپنے مذہب کی فضیلتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں اپنے دین کی طرف راغب کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی دوران کاریاکاکی کا شوہر آ گیا۔ وہ ایک

1- Ethiopia: A Country Study> Foreign Mission, Library Congress. Web. http:/www/toe.gou/rr/fri/httml 2- Law 1972/1939

3-Kokkinakis vs Greece, 260 Euro. Ct. H.R. (Ser. A) At 13, 1993

آرتھوڈیکس چرچ میں شماس کے عہدہ پر تعینات تھا۔ جیسے ہی اس کو حقیقت کا علم ہوا اس نے فوراً پولیس کو خبر دے دی اور کوکینا کیس اور ان کی بیوی دونوں کو پولیس نے فوراً گرفتار کرلیا۔ خانم کوکینا کیس کی بہت سی باتیں کاریاکا کی کو یاد نہیں رہ گئی تھیں پھر بھی اس نے بتایا کہ کوکینا کیس کی باتیں اسے اپنے مذہبی عقائد سے منحرف نہیں کرسکیں۔ اسی طرح چاہے ابتدائی مرحلہ ہو یا تجدید نظر کا مرحلہ اس کی سادگی یا اس کے مذہبی جذبات کے مجروح ہونے کی بات نہیں آئی البتہ کوکینا کیس کو یونان کی تمام عدالتوں نے مجرم قرار دیا لہذا اس نے یوروپی انسانی حقوق عدالت میں اپنی شکایت پیش کی۔

یہ معاملہ مختلف پہلوؤں سے توجہ و تجزیہ کے لائق ہے خصوصی اعتبار سے دین کے اظہار کے سلسلے میں عدالت کا یہ خیال تھا کہ لوگوں کو اس بات کا حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے لوگوں سے دین حق کے بارے میں بحث و مباحثہ کرتے ہوئے انہیں متقاعد کرنے کی کوشش کریں اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو کنونشن کی دفعہ ۹ کی عبارت جس میں تبدیلی دین کی بات کہی گئی ہے، بالکل بے معنی ہوجائے گی۔[1] عدالت نے اپنے اس استدلال میں حق اظہار دین کو آزادی بیان قرار دیا ہے کیونکہ مطبوعات یعنی پریس پر لگائی جانے والی پابندی صرف ان افراد کے حق میں مداخلت نہیں ہوتی ہے جو عملی طور پر اطلاعات کی جستجو میں رہا کرتے ہیں بلکہ اس پابندی سے ان لوگوں کی حق تلفی بھی ہوتی ہے جو اگر اطلاع حاصل کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں۔[2] اس قیاس کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تبدیلی دین کے بارے میں لازمی اطلاعات سماج کے سامنے ہمیشہ موجود رہنی چاہیے تاکہ اگر کوئی شخص اس کی طرف مائل ہونا چاہے تو فوری طور پر مطلوبہ اطلاع اسے فراہم ہوجائے۔

اسی طرح بعض مصنفین اس خیال کے حامل ہیں کہ مذہبی تبلیغات پر صرف اس وجہ سے کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی کہ اس کی وجہ سے ممکن ہے کہ لوگوں کے جذبات مجروح ہوجائیں بلکہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ لوگوں کو مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیے اور انہیں دین حق کے بارے میں اپنے افکار و عقائد کی تبلیغ و ترویج کی آزادی حاصل ہونی چاہیے کچھ لوگوں کی ناپسندیدگی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے مذہبی مبلغین کی تبلیغی سرگرمیوں کو ہرگز نہ روکنا چاہیے اور نہ ان سے خاموشی اختیار کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔[3] اس کے باوجود عدالت یہ خیال ظاہر کرتی ہے کہ عیسائی تبلیغی جماعت کی

1- Kokkinakis vs Greece, 260-Eur Ct. H.R. (Ser A) at 13, 1993

2- Sunday Times vs United Kingdom, Eur Ct. H.R. (Ser A) at 40, (1979)

3- The Right to Religious Liberty 70-71 (Barry Lynn et al eds 1995)

سرگرمیوں پر پابندی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ یونانی ماہرین قانون کے مطابق دوسرے تمام لوگوں کے حقوق کا دفاع کیا جاسکے جسٹس مارمینز نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کا خیال ہے کہ آزادی دین کا حقیقی اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ حکومت کو اس بات کا قطعی کوئی حق حاصل نہ ہونا چاہیے کہ وہ دین کی حفاظت یا اس کی تبدیلی کے سلسلے میں کوئی مداخلت کرسکے۔[1] اس اصول وفکر کے بموجب اس موضوع کا حکومت سے کوئی ربط ہی باقی نہیں رہ جاتا کہ کوئی شخص اپنے ضمیر و وجدان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنا مذہب تبدیل کرنا چاہتا ہے یا اس نے لوگوں کے بہکاوے میں آکر دین تبدیل کرنے کا فیصلہ لیا ہے۔ جب دنیا کے زیادہ تر ادیان و مذاہب اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی دین حق کی دعوت دیں تو حکومت کو اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرنی چاہیے اور حق اظہار دین میں کوئی مداخلت نہ کرنی چاہیے۔[2] کیونکہ انسان کی عظمت و آزادی کے احترام کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ہر شخص میں اتنی صلاحیت بہرحال ہوتی ہے کہ وہ اپنی قسمت کے سلسلے میں جو فیصلہ کرنا چاہے کرسکتا ہے لیکن جسٹس موصوف یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بعض معاملات میں یہ آزادی اپنے دین کی حفاظت کے سلسلے میں دوسروں کے حق سے میل نہیں کھاتی ہے لیکن دوسرے قاضی حضرات نے اس خیال کی تائید نہیں کی۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دین کی تبدیلی کا حق اس سلسلے میں قطعی مانع نہ ہوگا کہ حکومت ایسے اقدامات کرے کہ لوگ ان افراد یا جماعتوں کی حمایت کریں جو منظم طریقے سے لوگوں کے دین کی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔[3] اس معاملے میں کوکیناکیس درحقیقت اس سادہ لوح خاتون کے لئے بشارت وخوش خبری کے بہانے اپنے تجربہ و اعتمادنفس کو استعمال کرتے ہوئے اسے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ آرتھوڈیکس مذہب سے علحدگی اختیار کرلے اور کوکیناکیس جس مذہب کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے اس میں شامل ہوجائے۔ تبلیغ دین کے اس طریقے کو کسی اعتبار سے منطقی اور معقول تبلیغی مباحثہ ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

سرحد پار سے مذہبی تبلیغات: بعض ملکوں میں مذہبی تبلیغات کے سلسلے میں سماج اور حکومت کا طریقۂ کار نہایت واضح اور فیصلہ کن ہے کیونکہ جب کبھی کسی ملک میں سرحد پار سے کسی دین یا دینی عقیدہ کی تبلیغ وترویج کی کوشش کی جاتی ہے اور چونکہ یہ دینی تبلیغات بیرونی مبلغین کے ذریعہ انجام پاتی ہیں اسی وجہ سے اس ملک اور عوام کو ایک نئی تہذیب کا تجربہ حاصل ہوتا ہے جو اس ملک میں رائج

1- Kokkinakis vs Greece op.ct at 33 2- ibid-34 3- Arcot Krishnaswami. op.cit

تہذیبی اور ثقافتی روایات سے بالکل مختلف ہوا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ اس ملک کے قومی اتحاد کو خطرہ لاحق ہوجائے اور ملک پر خارجی تسلط کی زمین ہموار ہوجائے۔ استعماری حکومت کے دوران اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوا کرتی تھی کیونکہ برسراقتدار استعماری حکومتیں اس بات کی ہر ممکن کوشش کیا کرتی تھیں کہ اپنے زیر اثر نوآبادیاتی علاقے میں اپنے پسندیدہ دین یا مذہب کی خاطر خواہ تبلیغ انجام دیں آج ایسے بہت سے ملک موجود ہیں جہاں استعماری دور حکومت میں ان کے مذہب کو تبدیل کیا جاچکا ہے۔[1] پس اگر کسی ملک میں مذہبی تبلیغات سرحد پار تبلیغی جماعتوں کے ذریعہ انجام پاتی ہیں اور مبلغین بیرونی حمایت و سرپرستی کے حامل ہوتے ہیں تو ممکن ہے کہ اس ملک کی حکومت اس قسم کی تبلیغ کو قومی اتحاد کے خلاف تصور کرے اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں کو نفسیاتی دباؤ قرار دیتے ہوئے ایسے لوگوں کی حمایت پر آمادہ ہوجائیں جن کو بیرونی حمایت کے سایہ میں مذہبی تبلیغات کا نشانہ قرار دیا جارہا ہے۔[2]

روسی آرتھوڈیکس کلیسا کے رہبر دوم نے ۱۹۹۱ء میں اس سلسلے میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا کہ ان کے ملک میں مذہبی اور اقتصادی مبلغین کی ایک بھیڑ جمع ہوگئی ہے۔ انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ ان مبلغین کا یہ خیال ہے کہ سوویت یونین کے بکھراؤ کے بعد روس میں جو مذہبی بازار لگا ہوا ہے اس میں یہ لوگ اپنے مذہبی افکار اور اپنی معنوی پونجی پیش کرنے میں ہمہ تن سرگرم ہیں۔[3] کلیسا کے دوسرے ذمہ دار نے یہ اعلان کیا کہ: ''ملک کی سالمیت کے خواہاں گروہ مادی اور ظالمانہ راہ و روش کا استعمال کرتے ہوئے نومذہبی لوگوں کو روسی ادیان و مذاہب ثقافت اور خانوادوں کے خلاف تحریک کررہے ہیں''۔[4] ۱۹۹۳ء میں روسی آرتھوڈیکس کلیسا نے عیسائی تبلیغی جماعتوں بالخصوص مغربی دنیا سے تعلق رکھنے والے پادریوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ بھاری رقم اور منظم وسائل و امکانات کے ذریعہ بیرونی ادیان و مذاہب کی تبلیغ و ترویج میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ انسان دوستانہ امداد اور سیر و سیاحت کے وعدوں کے ذریعہ لوگوں کو اپنے دین کا گرویدہ بناتے ہیں جب کہ ملک کی اکثر آبادی ان کی اس حرکت کو پسند نہیں کرتی ہے کیونکہ ان بیرونی مبلغین کی وجہ سے ان کے قومی اور مذہبی احساسات کو چوٹ لگتی ہے۔ سردست روس میں غیر آرتھوڈیکس عیسائی کو ہر آدمی ناپسندیدگی کی نظر سے

۱- محمد حسین مظفری، ایضاً ۲- ایضاً

3- Joham Witt jr. Soul Wars, The Problem and Promise of Proselytism in Russia

4- ibid

دیکھتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایسا شخص روسی عوام کی معنوی وحدت اور مذہب آرتھوڈیکس کو نابود کرنا چاہتا ہے۔ ان لوگوں کی نظر میں حقیقی سامراجی وہ لوگ ہیں جو نامناسب وسائل کے ذریعہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ملک کے عوام کو کلیسا سے دور کردیں"۔[1]

بیرونی عیسائی تبلیغی جماعتوں کی سرگرمیوں پر پابندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے روسی آرتھوڈیکس کلیسا کے پادری نے اعلان کیا کہ: "آزادی کا مطلب مکمل اختیار کا حامل ہونا نہیں ہے۔ درحقیقت حضرت مسیح نے آزادی کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں پر ایک بڑی ذمہ داری بھی عائد کی ہے اور وہ ذمہ داری دوسرے لوگوں کی آزادی کا احترام ہے۔ اس کے باوجود بیرونی مبلغین کے اصولوں کو طاقت اور ظالمانہ راہ و روش کے ذریعہ ہم لوگوں پر لادنا دراصل ہم لوگوں کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کی خلاف ورزی ہے کیونکہ یہ لوگ ماحولیاتی اعتبار سے بالکل بیگانہ معلوم ہوتے ہیں"۔[2]

اسی طرح ان تبلیغی جماعتوں کی سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں کا معاملہ ہے جس میں اسپتالوں، اسکولوں اور ننھے منے بچوں کی نگہداشت کرنے والے مراکز کی ایجاد شامل ہے جن کو نامناسب تبلیغی راہ و روش میں شامل کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ سہولتیں دین کی تبدیلی میں ایک موثر وسیلہ کا درجہ رکھتی ہیں اور افریقی ملکوں میں ان تبلیغی جماعتوں کی سرگرمیوں کو نمونہ کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت بعض معاملات میں غیر مادی اجبار کا یہ حال ہے کہ معاشرہ کے مفلس و نادار طبقے کے لوگوں کو رشوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔[3]

مذہب کی منظم و منصوبہ بند تبدیلی: مذہبی تبلیغ متضاد حقوق کے تنازعہ کا میدان ہے۔ ایک طرف آزادی بیان دینی حمایت کے سایہ میں ہر قسم کے مذہبی اور غیر مذہبی افکار و عقائد کی ترویج و تبلیغ کو جائز قرار دیتی ہے اور دوسری طرف مخاطبین کے دینی عقائد کی حفاظت بھی لازمی ہے تاکہ نادار و مفلس لوگ اپنے دینی عقائد سے دستبردار ہونے کے لئے مجبور نہ ہوجائیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان متضاد و متعارض حقوق کے درمیان توازن کیسے قائم کیا جائے۔ سیاسی اور تمدنی حقوق کی قرارداد کی دفعہ ۱۸ بند ۲ کے مطابق کسی شخص کی آزادی کے حق کو نقصان پہنچانے کے لئے زور زبردستی کے استعمال کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۱ء میں جاری شدہ ایک اعلامیہ کی دفعہ ۱ بند ۲ کے مطابق کسی شخص کو ایسے دباؤ یا جبر و اکراہ کا نشانہ نہ بنانا چاہیے کہ وہ اپنے پسندیدہ دینی

1- Johan Witt Jr. Soul Wars: the Problem and Promise Proselytism in Russia
2- ibid
۳- محمد حسین مظفری، ایضاً

عقیدہ کے انتخاب و تحفظ سے عاجز ہوجائے یا اس کی آزادی کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

یہ باتیں انسانی حقوق کے اس منشور میں دکھائی نہیں دیتیں جو ۱۹۴۸ء میں پاس ہوا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس قانون کی تشکیل اسی وجہ سے عمل میں آئی تھی کہ استعماری دور میں رائج ظالمانہ تبلیغی راہ و روش کی مخالفت کرنے والے لوگوں کے مسائل کا حل پیدا ہوسکے۔ بہرحال ان قوانین و قرارداد کی تشکیل کے بعد تبلیغی راہ و روش کو منطقی استدلال، عملی مباحثات اور عقل و فکر کا تابع بنادیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں دوسروں کو متقاعد کرنے کے لئے جو طریقۂ کار اختیار کیا جائے اس میں جبر اور زبردستی کا کوئی دخل نہ ہونا چاہیے۔[1]

دین درحقیقت افکار و عقائد اور اعتقادات کا مجموعہ ہوتا ہے[2] اور اصولی اعتبار سے اس کو ایک انفرادی اور ذاتی مسئلہ قرار دیا جاتا ہے[3] اسٹراوڈ قانونی لغت میں دین و مذہب کی تعریف کے ذیل میں اس کے دو بنیادی عناصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ خدا پر مکمل اعتقاد و ایمان اور اس کی عبادت و بندگی دین کے دو اہم بنیادی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔[4] اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین ایک ذاتی اور خصوصی مسئلہ ہے جس کی وجہ سے انسان روحانی اعتبار سے اپنے پروردگار سے منسوب ہوجاتا ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس بات کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی کہ اس کو عالمی انسانی حقوق قرارداد کا موضوع بنایا جائے کیونکہ ان متحدہ پہلوؤں سے اس کا انسانی قلب کے نہایت مخفیانہ پہلو سے گہرا تعلق ہے۔

تبدیلی دین کا مرحلہ: دین و مذہب کی تبدیلی کیسے حاصل ہوتی ہے؟ جو شخص کسی دین کا گرویدہ ہوتا ہے وہ اس کی خصوصیات اور نمایاں صفات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ امید کرتا ہے کہ اس کا پسندیدہ دین سعادت و سربلندی کا حامل ہو اور اس کو روحانی نجات و کامیابی سے مالا مال رکھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے ایسے حالات ہیں جن کی وجہ سے کوئی شخص اپنے پسندیدہ دین کی خصوصیات اور نمایاں صفات کی تردید کرنے لگے یا اس اعتقاد کا حامل ہوجائے کہ اس کے دین میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس کی روحانی امیدوں کو پورا کرتے ہوئے اسے معنوی نجات عطا کرسکے۔ ایسے حالات

1- See generally: Malcolm D. Evans, Religious liberty and International law in Europe: 1997.
2- "Study on the Current Dimensions of the Problems of Intolerance and Discrimination on Grounds of Religion or Belief". Op. cit at p. 3
3- Brice Dickson, "The United Nations and Freedom of Religion" Int comp L. Q. No. 44, 1995, p. 327. 4- Stroud's Judicial Dictionary p. 2218 (5th Edition 1986).

میں اس بات کا قوی احتمال و امکان ہوتا ہے کہ وہ اپنے دین سے دستبردار ہوجائے اور اپنے ارمانات کی تکمیل کے لئے کسی دوسرے دین کی تلاش کرنے یا پوری طرح سے بے دین اور لا مذہب زندگی بسر کرنے لگے۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ کل انسان دین کے سلسلے میں خود کو مکلف مانتا تھا اور اس بات کی کوشش میں لگا رہتا تھا کہ وہ دین کے سلسلے میں اپنے فرائض سے پوری طرح آگاہ رہے اور حتی الامکان ان فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ لیکن آج صورت حال میں مکمل تبدیلی آچکی ہے آج انسان مذہب سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا اس کا مذہب اس کی امیدوں کو پوری کرسکتا ہے؟ لیکن مذہب کی تبدیلی ہمیشہ انسان کی فکری روش میں تبدیلی پیدا ہوجانے کی وجہ اس کے ذاتی ارادہ یا وجدانی حکم کی وجہ سے انجام نہیں پاتی ہے۔ زیادہ تر امور میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بیرونی عوامل کی دخالت افراد یا جماعتوں کے دین کی تبدیلی میں بہت موثر رہی ہے۔ لہذا یہ لازمی ہے کہ تبدیلی دین کے مرحلہ اور تبدیلی دین کے پروجیکٹ کے درمیان فرق تسلیم کیا جائے۔ وہ اسباب وعوامل جو انسان کی عقل اور اس کی وجدانی تصدیقات کے علاوہ اس سلسلے میں اثرانداز ثابت ہوں ان کے سلسلے میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ جملہ افراد، جماعتوں اور دینی اداروں کے اقدامات پر مشتمل ہوں[1]۔ ان اداروں اور تنظیموں کے نمائندے اس کوشش میں سرگرم رہا کرتے ہیں کہ اپنی دینی تعلیمات کو پیش کرتے ہوئے لوگوں کو اپنے مجوزہ دین کو قبول کرنے کی دعوت دیں اور ان افراد کے ذریعہ اس دین کی تعلیمات کی پیروی کے ذریعہ دوسرے لوگوں کو بھی اس دین کی پیروی پر آمادہ کرلیں۔ اس بات کی وضاحت پہلے بھی کی جاچکی ہے کہ ان سرگرمیوں میں تبلیغی طرز و ادا کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ بعض حکومتوں نے نامناسب اور خطرآمیز تبلیغی راہ و روش کو ممنوع قرار دیتے ہوئے اس کام میں لگے ہوئے افراد کے خلاف سزا بھی تجویز کی ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالمی منشور میں جس ''تبدیلی دین'' کی بات کہی گئی ہے اس سے کونسی تبدیلی مراد ومقصود ہے؟ کیا اس عبارت کے ذریعہ اس تبدیلیٔ دین کی حمایت مقصود ہے جو کسی شخص کی ذاتی فکر اور اس کی وجدانی تحقیقات کے نتیجے میں انجام پائی ہے؟ یا اس عبارت سے مراد وہ تبدیلی دین ہے جو خارجی عوامل کی ترغیب اور نفسیاتی و روحانی دباؤ کے نتیجے میں ظاہر ہوئی ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا اس عبارت کا حقیقی مقصد اس فرد کی آزادی کی ضمانت ہے جو

1- See Eugene P. Heideman, Proselytism Mission and the Bible, int' L Bull Missionary Res. No. 20. 1996 p. 10

اپنے دین کو اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق یا بیرونی اسباب وعوامل کے دباؤ کے نتیجے میں تبدیلی دین کا خواہاں ہے یا اس عبارت کے سایہ میں ان افراد یا جماعتوں کے حق کی ضمانت مقصود ہے جو دوسروں کے دین کی تبدیلی کا خواہاں ہے یا اس عبارت کے سایہ میں ان افراد یا جماعتوں کے حق کی ضمانت مقصود ہے جو دوسروں کے دین و مذہب کی تبدیلی میں ہمہ تن سرگرم ہیں؟

واضح رہے ایسے جبر و اکراہ اور زور و دباؤ کے استعمال کو ممنوع قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے کسی کے پسندیدہ دین وعقیدہ کے لئے خطرہ لاحق ہو۔ اس ممنوعیت کے دائرہ میں وہ مادی جبر اور دھمکی بھی شامل ہے جس کے ذریعہ کسی فرد واحد کے دین و مذہب کی تبدیلی کی زمین ہموار کی گئی ہو یا اپنے مطلوبہ دین سے دستبرداری اختیار کرنے کے لئے مجبور کیا گیا ہو، یا کسی فرد یا جماعت کو کسی مخصوص مذہب کے فریضہ کو انجام دینے یا انجام نہ دینے کے لئے مجبور کیا گیا ہو۔ ان تمام باتوں کے باوجود عالمی منشور کے اس بند میں غیر مادی اور نفسیاتی دباؤ کے استعمال کے سلسلے میں خاموشی سے کام لیا گیا ہے اور اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ کیا اس ممنوعیت اور پابندی کا اطلاق نفسیاتی اور اقتصادی اجبار اور دباؤ پر بھی ہوتا ہے اور بنیادی اعتبار سے جبر و دباؤ کی وہ کونسی شکلیں ہیں جن کو اس ممنوعیت اور پابندی کے دائرہ میں شامل کیا گیا ہے[1]۔ بہرحال داخلی قانون یا عالمی قانون کے مطابق اجبار اور دباؤ کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ دنیا کے زیادہ تر ملکوں کے داخلی قانون میں جبر و دباؤ کے سلسلے میں خصوصی توجہ اور وضاحت سے کام لیا گیا ہے اور اس ضمن میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ جبر و زبردستی کا استعمال معاملہ میں عدم نفوذ کا باعث ہوتا ہے اور بین الاقوامی قانون میں بھی لفظ جبر سے مراد اس قہری اور جابرانہ طاقت کا استعمال ہے جو معاہدوں کو باطل کردیتی ہے لہذا اس بات کی اہم ضرورت ہے کہ انسانی حقوق کے عالمی منشور اور معاہدہ میں اس موضوع کا بھرپور مطالعہ و تجزیہ کیا جائے تاکہ نامفہوم اور غیرواضح پہلوؤں کی وضاحت ہوسکے۔

پس اگر جماعتیں افراد یا کسی جماعت کے دین کو منصوبہ بند طریقے سے تبدیل کرنے کی کوشش کریں تو اس سلسلے میں حکومت کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟ کیا اسے ایک غیر جانبدارانہ تماشہ دیکھنے والے کا کردار ادا کرنا ہے یا لوگوں کے دین کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے لہذا اس اصول

1- Donna J. Sullivan "Advancing the Freedom of Religion or Belief through the UN Declaration on the Elimination of Religions Intolerance and Discrimination" American Journal of International Law. No. 82, 1988 p.487

کے مطابق لوگوں کے مذہبی حقوق میں نامناسب بیرونی مداخلت کا مقابلہ کرتے ہوئے اسے عوام کا دفاع کرنا چاہیے؟ اس سے قبل کوکینا کیس معاملے میں مارتنز نامی جج کے ذاتی نظریہ کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے جس میں اس نے یہ کہا تھا کہ مذہبی آزادی کا اصلی اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ حکومت کو مذہب کی حفاظت یا تبدیلی میں کوئی حق یا اختیار حاصل نہ ہونا چاہیے۔ اس بات کا حکومت سے کوئی واسطہ نہیں ہے کہ کسی شخص نے اپنے ضمیر کے فیصلے پر اپنا مذہب تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے یا دوسروں کے بہکاوے میں آ کر اس نے تبدیلی مذہب کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ انسان کی عظمت اور آزادی کے احترام کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم ہر آدمی کے بارے میں یہ تسلیم کرلیں کہ اس میں اپنے قسمت کے فیصلے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

۱۹۸۱ء میں مذہبی عدم تحمل کو محو قرار دینے والے اعلامیہ کی تدوین کے دوران ہونے والے مباحثات کے درمیان اسلامی ملکوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اسلامی جمہوریہ ایران نے ایک بار پھر اپنے اعتراض کا اظہار کرتے ہوئے یہ واضح کردیا تھا کہ مسلمانوں کو اس بات کی اجازت حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے مذہب کو تبدیل کریں اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے موت کی سزا بھگتنی ہوگی۔ البتہ اس بات کا اعتراف لازمی ہے کہ اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق آزادانہ طور پر کسی دین کے انتخاب یا کسی خارجی عنصر کے اثر و رسوخ اور جبر و دباؤ کی وجہ سے کسی دین کے انتخاب کے درمیان نمایاں سرحد کا تعین ناممکن ہے لیکن ان اسباب و عوامل کا مطالعہ و تجزیہ ضرور کیا جاسکتا ہے جو تبدیلی دین کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تبلیغی جماعتوں کی نا مناسب اور غیر قانونی تبلیغی راہ و روش کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے اور ان پر لازمی پابندی عائد کرنے کے سلسلے میں قانونی قدم اٹھائے جاسکتے ہیں۔[1]

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ انسانی فکر وعقیدہ خارجی جبر و دباؤ سے پوری طرح محفوظ اور مادی جبر و اکراہ کے مقابلے میں اس کا ایمان فولادی صفت کا حامل ہوتا ہے لیکن بعض لوگ عقل، سمجھ کی محدودیت اور تجربہ کی کمی کی وجہ سے اس میدان میں نقصان اٹھاچکے ہیں اور اگر کوئی ماہر شکاری اس میدان میں اپنے دام فریب کے ذریعہ شکار کرنا چاہے تو وہ آسانی سے لوگوں کو اپنا شکار بنالے گا آج کل کچھ جماعتیں ہپناٹزم، تمرکز احساس یعنی میڈیٹیشن، جادوگری اور شعبدہ بازی کے

1- See Arcot Krishnaswami op. cit, also see Int, L, Bull, Missionary Ros. No. 20, 1996 p. 10

ذریعہ سادہ لوح افراد کو اپنے مکر و فریب کا شکار بنا رہی ہیں۔

عالمی قوانین میں اجبار کا مفہوم: جدید عالمی قوانین میں اور معاہدات کے قوانین اور موضوعہ قوانین کے میدان میں ۱۹۶۹ء میں منعقد معاہدۂ ویانہ میں معاہدات پر اجبار کے اثر و رسوخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جو معاہدہ کسی ملک کے نمائندہ پر دھمکی کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں ان کا کوئی اعتبار و اعتماد نہیں ہوتا ہے البتہ ۱۹۶۹ء کے معاہدہ کے کاتبوں نے متفقہ طور پر یہ تسلیم کیا ہے کہ مسلط کردہ معاہدات کی بے اعتباری کی وجہ صرف رضا کی کمی نہیں ہے بلکہ اس اجباری عمل کا غیر قانونی ہونا اس معاہدہ کے اعتبار کو ختم کر دیتا ہے کیونکہ معاہدہ کی تخلیق میں لاقانونیت صاف ظاہر ہے۔[۱] عالمی قوانین کمیشن کے اراکین اور ویانہ کانگریس میں شریک بعض ملکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ زور و اجبار سے استفادہ کی دوسری شکل مثلاً ملکوں کے لئے اقتصادی بحران کی ایجاد کو معاہدہ میں مادی طاقت کے دیگر اسباب و عوامل کے ساتھ بیان و درج کیا جانا چاہیے۔ آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کانفرنس کی آخری سند میں ایک بیانیہ کا اضافہ ہونا چاہیے۔ جس میں طاقت کی کسی بھی شکل مثلاً فوجی، سیاسی اور اقتصادی طاقت کے استعمال کی مذمت کی جانی چاہیے۔[۲]

داخلی قوانین میں اکراہ کا مفہوم خارجی اور مادی اجبار اور اضطرار کو داخلی، نفسیاتی اور اقتصادی اجبار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اب ہم لوگوں کو یہ طے کر لینا چاہیے کہ عالمی قوانین اور انسانی حقوق معاہدہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اکراہ اور اضطرار کے مفہوم کے درمیان کوئی فرق ہے یا نہیں؟ ذیلی کمیشن نے اپنے اصول و آئین کے ڈرافٹ کی تدوین میں واضح تر عبارت کا استعمال کیا تھا اور ڈرافٹ کے متن میں غیر مادی اور مادی اکراہ کی وضاحت کر دی تھی جس کی رو سے کسی کو اخلاقی یا مادی اکراہ کا نشانہ نہ بنانا چاہیے جس کی وجہ سے اس کی آزادی یا دین و عقیدہ کی تبدیلی کو نقصان سے دوچار ہونا پڑے۔ انسانی حقوق سے وابستہ اسناد کے اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نیز مذہبی آزادی کے قوانین کی تکمیل کی خاطر اجبار کی ایسی تفسیر بیان کرنی چاہیے جس میں جسمانی اور مادی اجبار کے علاوہ نفسیاتی اجبار بھی شامل ہو۔ اس طرح اس ممنوعیت اور پابندی میں ایسے اعمال کی شمولیت بھی ہونی چاہیے جس میں فائدہ کا حصول یا حکومتی خدمات کی فراہمی کو کسی مذہبی عقیدہ کی قبولیت یا تردید سے وابستہ و مشروط کر دیا جائے مثلاً فرانس کے مدرسوں اور اسکولوں میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی ممنوعیت کو اس اکراہ و

۱- حقوق بین الملل معاہدات، ہدایت اللہ فلسفی، تہران، ۱۳۷۹ ۲- ایضاً

اجبار کی بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ سرکاری خدمات سے استفادہ کو اسلامی حجاب سے دوری و علیحدگی سے وابستہ کردیا گیا ہے۔ جب کہ اسلامی شریعت کے مطابق حجاب ایک لازمی حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح عیسائی تبلیغی جماعت کی ان سرگرمیوں کو ناجائز اور غیر قانونی تبلیغی راہ و روش قرار دیا گیا ہے جس میں رشوت کی ادائگی، مالی تحریص، سبز کارڈ کی فراہمی، عہدہ ملازمت، علاج، اقامتی اجازت، تعلیمی وظیفہ اور پناہندگی کی فراہمی کا وعدہ وغیرہ شامل ہیں۔

بہرحال ڈیلی کمیشن کا مجوزہ متن تو منظور نہیں ہوا اور اعلامیہ میں فقط اجبار کی ممنوعیت کی طرف اشارہ کیا گیا اور نفسیاتی و مادی پہلو کو متن سے حذف کردیا گیا۔ مغربی ممالک کے نمائندوں نے خصوصی طور پر اجبار کے وسیع مفہوم پر زور دیا جب کہ اسلامی ممالک کے نمائندوں کی بدنیتی کو بالکل بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا ہے۔ پس انسانی حقوق سے وابستہ اسناد میں فقط اسلامی انسانی حقوق اعلامیہ کی دفعہ ۱۰ میں دین یا عقیدہ کی تبدیلی کے سلسلے میں جبر و اکراہ کے علاوہ دیگر اسباب و عوامل کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے واضح رہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ یہ انسان کے خلاف ہر طرح کے جبر و اکراہ کا مخالف ہے۔ اسلام کی نظر میں انسان کی غریبی یا جہالت و نادانی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دین سے دوسرے دین کی تبدیلی یا دین و عقیدہ سے علیحدگی اور الحاد سے وابستگی ہرگز جائز نہیں ہے۔

بحرانی حالات جیسے ظہور انقلاب، جنگ، قحط، زلزلہ اور سیلاب وغیرہ کے دوران جس سے کسی فرد واحد یا افراد پر مشتمل کسی ایک جماعت کی قسمت وابستہ نہیں ہوا کرتی بلکہ کسی شہر یا ملک میں بحرانی حالات کے پیدا ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ متاثرہ علاقہ کے لوگوں پر ایسے حالات مسلط ہوجاتے ہیں کہ بڑا سے بڑا آزاد آدمی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسے حالات میں موقع پرست جماعتیں حرص و طمع کی وجہ سے لوگوں کے دین کی سوداگری میں مصروف ہوجایا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر وایٹ کا کہنا ہے کہ روس میں دس سال کی وسیع تبلیغات اور لوگوں کے درمیان تبدیلی دین کی دعوت اور مختلف النوع مذہبی تبلیغات کی وجہ سے بہت سی سہولتیں فراہم ہوگئیں ہیں اور ان خیرخواہانہ سہولتوں کی وجہ سے سنگر اور کافر کیمپوں میں دین کی تبدیلیت کا ماحول پیدا ہوگیا ہے لیکن دوسری طرف اس مسئلہ میں مختلف قسم کی پریشانیاں بھی پیدا ہوگئیں ہیں مثلاً مذہب کی تبدیلی کے لئے رشوت کی ادائیگی اور اس فکر کی ایجاد و ترویج کہ مذہب کی تبدیلی بڑی آسانی سے ممکن ہے۔ دین کی تبدیلی کے سلسلے میں اس پروپگنڈہ کی وجہ سے روسی عوام کے درمیان نفرت سی پیدا ہوگئی ہے اور وہ لوگ یہ محسوس

کرنے لگے ہیں کہ سرد جنگ میں کامیابی کے بعد مغرب نے دوسرے مذہبی انداز میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کردیا ہے۔[1] ان اقدامات کے ذریعہ سامراجی دور کی تبلیغی سرگرمیوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس کا حقیقی اور اصلی روپ انیسویں صدی کے دوران مشرق وسطی میں برطانوی اور فرانسیسی فوجیوں کی موجودگی میں عیسائیت کی تبلیغ کی شکل میں ظاہر ہوگیا۔ فوجی موجودگی کے سایہ میں بحران زدہ عوام کے درمیان عیسائی تبلیغی سرگرمیوں نے نہایت دشوار حالات پیدا کردیئے۔

جنگی قیدیوں کی مذہبی آزادی: ۱۲ اگست ۱۹۴۹ء کو جنگی قیدیوں کے ساتھ اخلاقی سلوک و برتاؤ کے سلسلے میں جینوا کنونشن میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی اس کی مختلف دفعات میں قیدیوں کے لئے ان لوگوں کی مذہبی آزادی کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس قرارداد کی دفعہ ۳۴ کے مطابق جنگی قیدیوں کو اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی اور مذہبی اجتماعات میں شرکت کی عملی آزادی حاصل ہوگی۔ ان کے مذہبی مراسم اور اجتماعات کے لئے خصوصی جگہ کا اہتمام کیا جائے گا لیکن انہیں متعلقہ حکومت کے احکام و قوانین کی پیروی بھی کرنی ہوگی۔ اس دفعہ کی روشنی میں جنگی قیدیوں کو ان کے مذہبی پروگرام میں عملی شرکت کی سہولت حاصل ہوگی اور متعلقہ حکومت کے فوجی افسران قیدیوں کو اپنے مذہبی مراسم میں شرکت سے منع نہیں کریں گے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ جنگی قیدیوں کو نہ کسی مخصوص مذہبی پروگرام میں شریک ہونے کے لئے مجبور کریں گے۔ جبر و اکراہ اور مادی زور و زبردستی کے ذریعہ جنگی قیدیوں کو تبدیلیٔ دین کے لئے آمادہ کرنا ممنوع ہے۔

درحقیقت جینوا کنونشن نے جنگی قیدیوں کی نگہداشت کرنے والی حکومت پر دو خصوصی فرائض عائد کئے ہیں۔ منظور شدہ قرارداد کی دفعہ ۳۴ میں سب سے پہلے ایک کام کو انجام دینے سے روکا گیا ہے۔ اس ضمن میں قیدی بنانے والی حکومت جنگی قیدیوں کے مذہبی پروگرام کے انعقاد اور اس میں ان لوگوں کی شرکت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرے گی اور اس کو یہ حق بھی حاصل نہ ہوگا کہ وہ جنگی قیدیوں کو کسی مخصوص مذہبی پروگرام میں شرکت اور طاقت و جبر کے ذریعہ انہیں اپنے مذہب کو تبدیل کرنے کے لئے مجبور کرے۔ اگرچہ اس قرارداد میں جنگی قیدیوں کے خلاف غیر مادی جبر کی بات تو نہیں کی گئی ہے پھر بھی یہ بات بخوبی واضح ہے کہ قرارداد کی اس عبارت ''جنگی قیدیوں کو اپنے مذہبی پروگراموں میں عملی شرکت کی آزادی حاصل ہوگی'' سے پتہ چلتا ہے کہ جسمانی یا نفسیاتی جبر و زبردستی

1- Jane lampman op cit.

کا استعمال مکمل آزادی کی ضد ہے پس جنگی قیدیوں کو کسی طرح کے اعصابی تناؤ میں مبتلا کرنا، ان کے ذہن پر کسی چیز کو زبردستی مسلط کرنا قانونی اور بہداشتی سہولتوں کو مشروط کرنا اور کسی مخصوص مذہب کے مراسم میں شرکت کے لئے جنگی قیدیوں کو مدعو کرنا اور ان کی رضامندی حاصل کرنا ممنوع ہے۔ دوسرے خصوصی فریضہ کا تعلق کام کے انجام دینے کی ماہیت سے ہے اور متعلقہ حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ان امور کو انجام دینے کے لئے لازمی وسائل و امکانات فراہم کرے جس کا ذکر قرارداد کی دفعہ ۳۵ میں کیا گیا ہے جو مذہبی علماء دشمن کی فوج کے ہاتھ آ جائیں انہیں جنگی قیدیوں کی مدد کے لئے ان کی رضامندی یا زور و زبردستی کے ساتھ قیدیوں کی اقامت گاہ میں روکا جائے۔ ان علماء کو جنگی قیدیوں کے درمیان اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کی مکمل آزادی حاصل ہوگی تاکہ وہ قیدیوں کے وجدان کے مطابق مذہبی مراسم کا اہتمام کریں ایک زبان، ایک ملک و حکومت اور ایک مذہب کی پیروی کرنے والوں کو جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں ایک ہی جگہ رکھا جائے گا۔

سرزمین پر قبضہ: روس میں عیسائی تنظیموں کے تجربہ کے سلسلے میں ڈاکٹر داٹ کہتا ہے کہ عیسائی تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کے ناپسندیدہ و نا مطلوب نتائج اور منفی پہلو کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ ان سرگرمیوں کی مختلف شکلوں سے معنوی رشوت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مغربی جماعتوں نے دین کے سلسلے میں جو باتیں پیش کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مذہب کی تبدیلی بہت آسان کام ہے۔ مغرب کا یہ طرز فکر آرتھوڈکس عیسائیوں اور مسلمانوں کی روایت سے بالکل مختلف ہے۔ اسی وجہ سے روس نے حقوق اور آزادیوں کے سلسلے میں ایک قانون پاس کرتے ہوئے ان میں سے زیادہ تر آزادیوں کو حکومت سے وابستہ جماعتوں کے مفاد میں محدود کر دیا[1]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی تبلیغی جماعتوں کے سلسلے میں روسیوں کا یہ نظریہ موجودہ زمانہ میں عراق کے سلسلے میں بالکل حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ سردست عراق اس مغربی اتحادی فوج کے قبضہ میں آ گیا ہے جس کی کمان و قیادت امریکہ کے ہاتھوں میں ہے اور اس وقت عیسائی تبلیغی سرگرمیاں امریکی فوج کی حمایت و سرپرستی کے سایہ میں عراقی علاقوں میں ہمہ تن سرگرم عمل ہیں تاکہ ملک کے حالیہ بحرانی حالات اور لوگوں کی ضرورت اور بے سرو سامانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عراقی عوام کو دین کی تبدیلی کے لئے آسانی سے آمادہ کر لیں اور ایک منصوبہ بند پروگرام کے تحت عراقی مسلمانوں کے دین کو تبدیل کر دیا جائے۔ تبلیغ دین کی آزادی کا حق

1- Jane lampman of cit.

اور فرد واحد کے ضمیر کی آزادی کے حق کے درمیان حملہ آورانہ تبلیغ نے دوسروں کی مداخلت کے سلسلے میں رکاوٹ پیدا کردی ہے۔ گذشتہ چند برسوں کے دوران انجیلی کی گرجا گھروں نے شمالی افریقہ، مشرق وسطی اور ایشیائی علاقوں کو عیسائیت کی کھڑکی قرار دیتے ہوئے ان علاقوں میں عیسائی تبلیغی سرگرمیوں کو اولیت دینے کا اعلان کیا ہے۔[1]

اسلامی ملکوں نے بھی عیسائی تبلیغی سرگرمیوں کے سلسلے میں مختلف موقف اختیار کر رکھا ہے۔ مثلاً پاکستان عیسائی مبلغین کو ویزا فراہم کرتے ہوئے ان کی تبلیغی سرگرمیوں کے جاری رکھنے کی حمایت کرتا ہے لیکن سعودی عرب میں عیسائی مبلغین کو تبلیغی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ عیسائی پہلی صدی کی ابتداء ہی سے مشرق وسطی میں موجود تھے اور ماضی میں مسلمانوں کے ساتھ صلح آمیز زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ جب کبھی عرب علاقوں میں آباد عیسائیوں نے مال و دولت اور دیگر وسائل و امکانات کے ذریعہ اور نامناسب راہ و روش سے کام لیتے ہوئے لوگوں کے دین کی تبدیلی کی کوشش کی انہیں پریشانیوں کا منھ دیکھنا پڑا۔ ڈاکٹر حسین نصر کا خیال ہے کہ ''سچے عیسائی مبلغین سے مسلمانوں کی کوئی عداوت نہیں ہے لیکن مسلمان اس بات سے غیر معمولی طور پر ناراض ہوتے ہیں کہ امریکہ مال و دولت کی فراہمی اور مادی امتیازات کے ذریعہ لوگوں کو عیسائی بنانے میں سرگرم ہے۔ غریب اور مفلوک الحال لوگوں کے بیمار بچوں کے علاج اور ان کے جانوروں کے لئے ٹیکا اس شرط کے ساتھ فراہم کرنا کہ وہ کلیسا کے پروگرام میں شرکت کریں۔ مہربانی کے مظاہرے سے مذہبی تبلیغات کو ہر ممکن فروغ دینے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ عیسائی مبلغین کی مکاری اور دغابازی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں''۔[2]

مادر جونز نامی رسالہ میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ نے عیسائی مبلغین کے خفیہ پروگرام کو پوری طرح بے نقاب کردیا تھا۔ واضح رہے کہ جدید مبلغین کی تربیت کے لئے تعلیمی پروگرام مرتب کئے گئے تھے تاکہ لازمی ٹریننگ کے بعد انہیں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں بھیجا جا سکے جہاں عیسائی تبلیغی سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی۔ اس تربیتی پروگرام میں یہ بات بھی شامل تھی کہ مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف راغب کرنے کے لئے ان سے کیسے رابطہ قائم کیا جائے۔ اخلاقی اغراض و مقاصد کے لئے دورغ گوئی فریب کاری اور دغابازی سے کام لینا ان لوگوں کے لئے کوئی

1- Jane lampman op cit. 2- ibid

بڑی بات نہیں تھی"۔[1]

۱۹۴۹ء میں منظور شدہ جنیوا کنونشن میں جنگ کے دوران غیر فوجی عوام کی امداد و حمایت کے سلسلے میں کہا گیا ہے:

دفعہ ۵۸ قابض و غاصب فوج مذہبی رہنماؤں کو اس بات کی اجازت و سہولت فراہم کرے گی کہ وہ اپنے مذہبی اور معنوی خدمات کا اہتمام کریں۔ اس کے علاوہ قابض فوج والے مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے لازمی کتاب اور دیگر وسائل کو مقبوضہ سرزمین کے باشندوں کے درمیان تقسیم کرنے کی سہولت بھی فراہم کریں گے۔

دفعہ ۹۳ مقبوضہ علاقوں میں موجود لوگوں کو اپنے مذہبی فرائض کو ادا کرنے نیز دینی پروگراموں میں شرکت کرنے کے لئے عملی آزادی حاصل ہوگی لیکن انہیں مقبوضہ علاقوں میں قابض حکمرانوں کی طرف سے جاری احکام کی پیروی کرنی ہوگی۔ دوسری طرف مقبوضہ سرزمین میں موجود مذہبی علماء کو یہ سہولت حاصل ہوگی کہ وہ اپنے مذہبی معاشروں کے درمیان لازمی خدمات انجام دیں۔ بالخصوص جنگی قیدیوں کی نگہداشت کرنے والی حکومت کے فرائض کے بارے میں جو باتیں بیان کی گئیں وہ اولیت کے ساتھ اور تاکیدی طور پر قابض فوجوں کے بارے میں پیش کی گئی ہیں۔ لہذا نہ صرف یہ کہ قابض فوجوں کو مذہبی تبلیغات کے کاموں میں پیش قدمی نہ کرنی چاہیے بلکہ اسے انسانی دوستانہ سرگرمیوں کی باقاعدہ نظارت کرنی چاہیے تاکہ یہ تمام رفاہی امور غیر جانبدارانہ طور پر انجام پاسکیں۔

نتیجہ گیری

۱- گذشتہ دو دہائیوں کے دوران مغربی ماہرین سیاست تحریک اصلاح دین و دینی و حکومتی تنظیموں کے درمیان جدائی جیسے تجربات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمان حاکموں اور دانشوروں کو ہمدردانہ طور پر یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ دین و حکومت کے درمیان جدائی و علیحدگی کی بنیاد پر حکومتی ڈھانچے کی تعمیر و تشکیل درحقیقت فقط مغربی تہذیب و تمدن کا خاصہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک گرانقدر انسانی نعمت ہے اور دنیا کی تمام اقوام کو مغربی تہذیب کی دیگر نعمتوں کی طرح اس نعمت سے وابستہ رہنا چاہیے اور دین کی سعادت و نجات کی جستجو اسی راہ پر چلتے ہوئے کرنی چاہیے۔

ایسے حالات میں امریکہ میں لوگوں نے اس تہذیب و تمدن کی ایک ترقی یافتہ ترین جماعت تیار

1- Jane lampman op cit.

کرلی جس نے سیکولرازم کی تردید کرتے ہوئے ایک لاکھ ڈالر کے انعام کا اعلان اس شخص کے لئے کیا جو امریکہ کے آئین میں ان حقائق کی نشاندہی کردے جن کے بموجب دین اور حکومت کے درمیان جدائی اور علیحدگی کو ثابت کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ ارباب حکومت نے اس بات کی بھی بھرپور کوشش کی کہ حکومت کے دس اہم فرامین بڑے بڑے شہروں اور اہم سرکاری اداروں میں نصب کردیے جائیں۔ صدر جمہوریہ کے چناؤ میں اس جماعت نے طاقت کے مراکز پر اپنا قبضہ جمالیا جن کو عیسائی صیہونی کے نام سے یاد کیا گیا۔ ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ طاقتور فوج حضرت مسیح کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے تباہ کن اسلحوں کے ذریعہ رعب و دبدبہ کے سایہ میں عیسائی بشارت و خوشخبری کو ساری دنیا میں پھیلادیں۔ صدر جمہوریہ امریکہ نے عراق پر اپنے حملے کے دوران اور اس کی جنگ طلبی کے مقابلے میں رائے عامہ کی مخالفت کرتے ہوئے یہ دعوی کیا تھا کہ وہ اس مقابلے میں خداوند عالم سے حکم حاصل کرتا ہے پس سامراجی دور میں یورپ والوں نے جو کام نامکمل چھوڑ دیا تھا اب انہیں امریکہ کے ذریعہ اپنی فوجی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے اس ملک کے ناقابل قبول افکار و عقائد کا مقابلہ کرنا ہے۔

۲۔ مغربی دنیا میں دین و حکومت کے درمیان جدائی اور سیکولرازم کا تجربہ ایشیائی اور افریقی ملکوں کے لئے ایک عبرت آموز تجربہ رہا ہے۔ سیکولرازم یورپ میں موجود مخصوص سیاسی و سماجی حالت میں رو نما ہوا۔ چونکہ وہ اس سرزمین کا مقامی پودا تھا اسی وجہ سے اس نے اس علاقے میں غیر معمولی فروغ و نشو و نما بھی حاصل کی لیکن اس پودے کو غیر مقامی اور بیگانہ سرزمین میں لگانا اور زور و زبردستی اور طاقت و لالچ کے ذریعہ اس کو فروغ دینا ایک لاحاصل کوشش کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس سعی لاحاصل کے ذریعہ سیکولر معاشرہ کی تخلیق ممکن نہیں ہے[۱]۔ جب کہ یہ سیکولرازم مغربی دنیا میں مذہبی آزادی کی خوشخبری کی حامل رہی ہے اور دین و حکومت کے درمیان جدائی و علیحدگی کا بنیادی مقصد یہ رہا ہے کہ حکومت لوگوں کے مذہبی امور میں کم سے کم مداخلت کرے۔ سردست ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مغربی مفکرین نے اپنی ثقافتی قدروں کے حالیہ تجزیہ کے دوران ان دونوں اداروں کے درمیان علیحدگی و جدائی کو افسانہ قرار دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس سلسلے میں شروع ہی سے صحیح

۱۔ دنیای اسلام میں انسانی حقوق کے مسائل: محمد حسین مظفری، پگاہ حوزہ، شمارہ ۴۱، ۱۳۸۰، ص ۵۰

وضاحت نہیں کی گئی۔[1]

۳- عراق میں جلد بازی میں کئے گئے اقدامات مثلاً وہائٹ ہاؤس میں مذہبی امور کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل کو سرزمین عراق میں غیر حکومتی اداروں کی تشکیل و تنظیم کا انچارج تعینات کیا جانا اور منصوبہ بند پروگرام کے مطابق عیسائی تبلیغی سرگرمیوں میں غیر معمولی اضافہ کو دیکھتے ہوئے عیسائی مفکرین اور دانشوروں کے درمیان بھی بے چینی کا پیدا ہونا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ جلد بازی کا وہی منفی اثر مرتب ہو جو ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو رونما ہونے والے حادثہ کے فوراً بعد بُش کے اس بیان کا ہوا تھا جس میں انہوں نے اس حملے کو صلیبی جنگ سے تعبیر کیا تھا اور جس کی وجہ سے اصل منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا بالکل اسی طرح تبلیغی سرگرمیوں کے لئے بھی مسائل پیدا ہوسکتے ہیں جیسے امریکہ کی امدادی اور بشر دوستانہ تنظیموں کی یلغار کی وجہ سے مغربی عیسائی اور روسی عیسائیوں کے درمیان تعلقات خراب ہوگئے تھے۔ اسی وجہ سے وودبیری کا خیال ہے کہ سردست امریکیوں اور عیسائیوں میں شدید بے اعتمادی پائی جاتی ہے۔ لہذا اس سلسلے میں جو بھی قدم اٹھایا جائے اس میں عراقی عیسائیوں کا تعاون لازمی ہے اور تبلیغی مشن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عربی عیسائی تنظیموں کو سربراہی کرنی چاہیے۔[2] وایٹ کہتا ہے کہ عراق مغربی عیسائی تبلیغی تنظیموں کی پریشانیوں کا دوسرا منظر پیش کرتا ہے کیونکہ ان لوگوں کو اپنے مذہبی عقائد کے لئے نیا بازار مل گیا ہے حالانکہ یہاں کے مقامی لوگ ان عقائد کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں اور ان لوگوں کے مال کا کوئی خریدار نہیں ہے۔[3]

۴- مغربی مفکرین کی دوسری جماعت دوسری ذہنی کشمکش کا شکار تھی۔ ان لوگوں کو صاف صاف یہ دکھائی دے رہا تھا کہ مغربی سرزمین سے اٹھنے والی آزادی اور انسانی حقوق کی حمایت کی ہر آواز ان کے حالیہ اقدامات کی وجہ سے ماند پڑتی چلی جارہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مغربی نعروں میں پہلی جیسی تڑک بھڑک باقی نہیں رہ گئی ہے اور ان کے لئے نئے نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ اسی طرح سیکولر نظام اور مذہب کے سلسلے میں حکومت کی غیر جانبداری کا بنیادی تقاضہ ہے کہ دینی تبلیغات کے معاملے میں فوج کی مداخلت پوری طرح ممنوع ہے۔ پس عیسائی امدادی اداروں یا تنظیموں کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ فوجی تسلط و غلبہ کے دوران سرزمین عراق کے مظلوم و ستم رسیدہ عوام کی ضرورتوں اور پریشانیوں کا ناجائز استعمال نہ کریں اور ان بحرانی حالات کے دوران اس

۱- مزید اطلاعات کے لئے ملاحظہ ہو مارشل یونیورسٹی میں Edwin kagin کی Separation of Church and State کے موضوع پر ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو کی گئی تقریر
2- Jane lampman op cit.
3- ibid

ملک میں کسی مخصوص دین کی منصوبہ بند حمایت و ترویج و اشاعت کے لئے کوئی اقدام نہ کریں۔

۵- Chiristian Science Monitor نامی اخبار نے ڈاکٹر حسین نصر سے منسوب ایک مقالہ میں لکھا ہے اگرچہ مذہبی حقوق و آزادی جیسے امور کے سلسلے میں انسانی حقوق کے عالمی منشور کی تدوین عمل میں آ چکی ہے لیکن اس منشور میں دینی تبلیغات کے مناسب اور نامناسب طریقوں کی وضاحت نہیں کی گئی ہے''۔[1] اگر ڈاکٹر حسین نصر نے یہ بات کہی ہے تو ان کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ اس عالمی منشور میں مذہبی حقوق و آزادی سے متعلق جملہ امور و مسائل مثلاً تبدیلی دین کے سلسلے میں اختیار کی جانے والی اغواگرانہ و ظالمانہ راہ و روش کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے لیکن یہ جاننا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عالمی منشور میں انسانی حقوق سے متعلق جملہ بین الاقوامی معاہدوں اور قراردادوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے بلکہ دیگر اسناد و مدارک میں ان معاہدوں کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ پس قانونی اعتبار سے وائٹ کا یہ خیال درست اور حق بجانب ہے کہ ان تبلیغی تنظیموں کو ایسا لامحدود اور غیر مشروط حق و اختیار حاصل نہیں ہے کہ اپنی من مانی کریں لہذا فوجی قوانین میں موجود اختیارات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ان تبلیغی تنظیموں کی سرگرمیوں پر زیادہ سے زیادہ پابندیاں لگائی جاسکتی ہیں۔[2]

۶- جب ۱۹۴۸ء کے عالمی منشور کی دفعہ ۱۸۰ میں ''حق تبدیلی دین یا عقیدہ'' کی عبارت کو درج کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو بعض اسلامی ممالک کے نمائندوں نے اپنے مناسب اعتراض کا اظہار کیا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اگر دوسرے اغراض و مقاصد کارفرما نہ ہوں تو اس اضافی عبارت کی شمولیت کے بغیر بھی دین و عقیدہ کی آزادی کا حق پوری طرح واضح ہے۔ اس بدگمانی کو اس وقت غیر معمولی تائید و حمایت حاصل ہوگئی جب مجوزہ دفعہ میں دینی امتیاز و عدم تحمل کو محو کرنے کے بارے میں ہونے والے بحث و مباحثہ کے دوران خصوصی طور پر نفسیاتی جبر و تشدد کے استعمال والی تجویز پاس نہیں ہو پائی اور اسے عالمی منشور کے متن سے پوری طرح حذف کر دیا گیا۔ اس کی وجہ سے ذیلی کمیشن کا مجوزہ متن بھی پاس نہیں ہوسکا بلکہ فقط ظلم و جبر کی ممنوعیت کی طرف اشارہ کیا گیا اور ''نفسیاتی یا مادی'' الفاظ کو بھی اس دفعہ کے متن سے خارج کر دیا گیا۔

پس انسانی حقوق کی اسناد میں مذکور اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے اور مذہبی حقوق و آزادی کو مکمل ضمانت فراہم کرنے کے لئے اجبار و دباؤ کی ایسی وضاحت کی جانی چاہیے کہ اس میں جسمانی

1- Jane lampman op cit. 2- ibid

اور مادی اجبار و دباؤ کے علاوہ نفسیاتی دباؤ کی شمولیت ہو جائے۔ اس ممنوعیت میں ان اعمال و افعال کا شامل ہونا بھی لازمی ہے جس میں کسی مخصوص مذہبی عقیدہ کی تردید یا قبولیت کو مادی فائدہ و سرکاری ملازمت کی فراہمی یا عدم فراہمی کا وسیلہ قرار دیا گیا ہو۔

۷۔ اس وضاحت اور مذہبی حقوق و آزادی کے سلسلے میں ہونے والے معاہدوں کے متن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا جاسکتا ہے کہ اس سلسلے میں قابض و مسلط فوجوں پر دو اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ پہلی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ عراقی عوام کے لئے ایسے حالات فراہم کئے جائیں کہ وہ کسی مزاحمت یا پریشانی کے بغیر مذہبی مکانات اور امکانات تک رسائی حاصل کرسکیں۔ پس قابض و غاصب حکومتوں کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ عوام کی مذہبی سرگرمیوں کے سلسلے میں کوئی پابندی لگاسکیں۔ دوسری طرف اس ملک کے بحرانی حالات اور سماجی کشمکش پر مشتمل صورتحال کو نگاہ میں رکھتے ہوئے قابض افواج کی ذمہ داری ہے کہ وہ امدادی اداروں کی انسان دوستانہ سرگرمیوں پر بھی کڑی نگاہ رکھیں اور یہ نظارت پوری طرح غیر جانبدارانہ صفات کی حامل ہونی چاہیے۔ اگر کسی گاؤں والے کی گائے کو ٹیکہ لگانے یا اس کے بیمار بچے کو دوا دینے کے لئے یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ وہ کلیسا میں منعقد کسی مخصوص پروگرام میں ضرور شریک ہو تو یہ کسی کی مجبوری و مفلوک الحالی سے ناجائز فائدہ حاصل کرنا ہوگا اور یہ کام انسانی حقوق سے وابستہ بین الاقوامی معاہدوں کی اعلانیہ خلاف ورزی اور انتہائی مذموم حرکت ہے۔ اسی طرح اگر کسی آدمی کو سرکاری ملازمت یا مراعات فراہم کرنے کے لئے یہ امدادی تنظیمیں یہ شرط لگاتی ہیں کہ وہ کوئی مخصوص دین یا مذہبی عقیدہ قبول کرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس آدمی کی دین کو خریدنے کے لئے رشوت فراہم کی جارہی ہے۔ ایسے اقدامات کے ذریعہ نہ صرف انسانی حقوق سے وابستہ بین الاقوامی قرارداد اور معاہدوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے بلکہ یہ عمل آسمانی ادیان و مذاہب کی تعلیمات کے برعکس بھی ہے۔

۸۔ بعض غیر مستند اطلاعات کے بموجب بعض عیسائی تبلیغاتی تنظیمیں مغربی ممالک میں اپنی منصوبہ بند دینی سرگرمیوں کے ذریعہ پناہ گزیں افراد و جماعتوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ ان کا مقصد جذب و تطبیق یعنی Assimilation Process کے ذریعہ لوگوں کو گرویدہ بنانا ہوتا ہے یہ تنظیمیں پناہ گزیں کیمپوں کے اعلیٰ افسران کی حمایت و ہم آہنگی کے ذریعہ لوگوں کے نفسیاتی حالات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش میں سرگرم عمل رہا کرتی ہیں اور حالات و صورت حال

سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سادہ لوح افراد کی Brain washing کے لئے طرح طرح کی دواؤں کا استعمال کرتی ہیں تاکہ لوگوں کے اعصاب میں تناؤ پیدا کرسکیں چنانچہ پناہندگی کی درخواست کی منظوری سے قبل لازمی نفسیاتی دباؤ کی وجہ سے یہ لوگ مطلوبہ دین کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔

پیرس میں برسوں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے والے اروگوئیائی باشندہ مارچلو ویگنار کا خیال ہے کہ لوگوں کو اذیت میں مبتلا کرنا ان اقدامات کا اٹوٹ حصہ ہے جس کو عمداً اعتقادات و ارمانات کو محو کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن نفسیاتی اذیت و دباؤ کا مقصد زیادہ اہم اور پیچیدہ ہوا کرتا ہے اور اس ہتھکنڈے کو زیادہ تر مذہبی عقائد کی نابودی یا نئے مذہبی عقائد کی قبولیت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جس کو انگریزی اصطلاح میں Brain washing سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ہتھکنڈہ کے شکار شخص کے ذاتی مذہبی اعتقادات کو نابود کرتے ہوئے نئے دین و مذہب کو اس کے ذہن میں بٹھادیا جاتا ہے۔[۱] لیکن دباؤ اور اذیت کے ایک ہی نسخے کو ہر مقبوضہ سرزمین کے لوگوں پر استعمال کرنا مفید و کارگر ثابت نہ ہوگا۔ ایسا لگتا ہے کہ اسلامی ممالک میں تبلیغی سرگرمیوں میں لگی ہوئی عیسائی تنظیمیں اپنی سادہ خیالی کی وجہ سے یہ تصور کرتی ہیں کہ افریقی ممالک کے دور افتادہ علاقوں میں رہنے والے بدوی عوام کی طرح مسلمان بھی آٹے کی ایک بوری یا کھانسی دور کرنے والے شربت کی ایک بوتل کے بدلے میں اپنا دین فروخت کردیں گے اور ہمیشہ کے لئے عیسائی عقیدہ کے پیرو ہوجائیں گے۔ درحقیقت دین و ایمان کی جڑیں دل کی گہرائی میں ہوا کرتی ہیں اور ان اوہام کے ذریعہ کسی قوم کی دینی شناخت کی تبدیلی ناممکن ہے"۔[۲] سابقہ سوویت ملکوں میں عیسائی تبلیغی اداروں کی حملہ آورانہ سرگرمیوں سے حاصل ہونے والے تجربات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ مذہب دشمن ماحول میں برسوں زندگی بسر کرنے والے آرتھوڈیکس مذہبی لوگوں کو کیتھولیک یا پروٹسٹینٹ مذہب کا گرویدہ تو بنایا جاسکتا ہے لیکن ۱۷ ویں اور اٹھارویں صدی میں فوجی قبضہ اور رعب و دہشت گردی کے سایہ میں ان ظالمانہ ہتھکنڈوں کے جواب میں غاصب وحملہ آور کے خلاف غیر معمولی نفرت کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

۱- مریم رسولیان، مجلۂ آفتاب، شمارہ ۱۲، بہمن ۱۳۸۰، ص ۳۶ ۲- سمیر العراق، روزنامہ الوطن قطر
Http-www-alwatan.com.sa-daily-2003-04-10-index.htm.